عقیدۂ ختم نبوت پر علمی و تحقیقی مجلّہ

خصوصی اشاعت

اُردو، انگلش

جلد 8 جنوری تا جون 2024ء شمارہ 26,27

اسلام اور قادیانیّت

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

عقیدہ ختم نبوّت اور فتنہ قادیانیّت سے متعلق حکیم الاُمّت کے مکتوبات جو اُن کی حیات میں شائع ہوئے

مدیرِ اعلیٰ : خواجہ غلام دستگیر فاروقی

زیر ظلِ عاطفت

متوکل علی اللہ، یادگار اسلاف قبلہ

حافظ محمد قاسم علی ساقی مدظلہ

آستانہ چشتیہ خیریہ جلال پور درس، شکر گڑھ

Regd. 2-66/8288

سہ ماہی

رجسٹرڈ

المنتہیٰ

جلد 8 | جنوری تا جون 2024ء | شمارہ 27,26

سرپرست اعلیٰ

عالمی مبلغ اسلام شیخ طریقت حضرت العلام

خواجہ محمد بدر عالم جان زید مجدہٗ

سجادہ نشین دربار عالیہ مرشد آباد شریف پشاور شہر

مدیر اعلیٰ

خواجہ غلام دستگیر فاروقی

مدیر

صاحبزادہ مفتی غلام مرتضیٰ ساقی

مجلس ادارت

- مفتی محمد اسد اللہ نوری
- ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی الازہری
- ڈاکٹر محمد بلال شرفی القادری
- محمد ثاقب رضا قادری
- علامہ غلام مصطفی مجددی
- پروفیسر علی وقار قادری

مجلس مشاورت

- علامہ محمد اصغر شاکر
- قاری محمد مجید نوری
- حافظ محمد آصف قادری
- قاری نعیم احمد سلطانی

قانونی مشیر: رانا محمد شفیق ایڈووکیٹ

نگران طباعت: صابر علی قادری

متعاون: حافظ علی رضا فیض، اکرام اللہ صدیقی

رابطہ کمیٹی

- عمر علی قادری
- قاری نور نبی نقشبندی
- حافظ حماد ملک
- 0306-4373145
- 0342-5428102
- 0303-5238504

سرکولیشن انچارج: راحیل احمد چشتی 0302-3911531

قیمت فی شمارہ -/250 روپے

المنتہیٰ میں شائع ہونے والی نگارشات کے نفسِ مضمون کی ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے

غلام دستگیر فاروقی نے منہاج القرآن پبلی کیشنز سے چھپوا کر آستانہ چشتیہ خیریہ شکر گڑھ سے شائع کیا۔

مرکزی آفس: ادارۃ المنتہیٰ پاکستان جلال پور درس (چک امرو روڈ) شکر گڑھ

زونل آفس: جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور

E-mail:farooqi4156@hotlook.com

اسلام اور قادیانیت

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

صفحات : 116

ناشر : إدارۃ المنتہیٰ پاکستان

ایڈیشن اوّل : جنوری تا جون 2024ء، جلد: 8 شمارہ: 27,26

ملنے کے پتے:

* إدارۃ المنتہیٰ پاکستان جلال پور درس (چک امرووڈ) شکر گڑھ (0303-8517218)
* جامعہ رحمت قائد اعظم ٹاؤن صادق چوک ٹاؤن شپ لاہور (0302-3911531)

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
(۱)	پیش لفظ	۰۴
(۲)	قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان	۰۶
(۳)	دی لائٹ وغیرہ کے جواب	۱۳
(۴)	اسٹیٹس مین کے نام ایک مکتوب	۱۸
(۵)	رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت	۲۱
(۶)	اسلام اور احمدیت	۲۴
(۷)	احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب	۵۰
(۸)	مسابقہ اربعین ختم نبوت 2023ء (رپورٹ)	۵۱
(۹)	''وفائے ختم نبوت تربیتی نشست'' (رپورٹ)	۵۴
(۱۰)	سپریم کورٹ کا فیصلہ (اعلامیہ) (رپورٹ)	۵۵

پیش لفظ

(مدیر اعلیٰ)

عقیدہ ختم نبوت دین اِسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔اس عقیدہ کی حفاظت کیلئے قرآن وسنت نے توحید کے بعد بہت زور دیا ہے۔اوائل اسلام سے لے کر اب تک اُمت اجابت کے ہر ذمہ دار فرد نے اس عقیدہ کا پہرہ دیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند نے جہاں بلند پایہ بہت سی شخصیات کو جنم دیا ہے انہی چند افراد میں فرد فرید حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کا نام ہے جن کی خدمات ملک وملت کیلئے ناقابل فراموش اور انمٹ ہیں۔مزید برآں اہل حق قافلہ تحفظ ختم نبوت کی خوش نصیب ہستیوں میں ایک خوش نصیب نام حضرت اقبال کا ہے۔جنہوں نے مفکرانہ، مدبرانہ اور فلسفیانہ اسلوب کے ساتھ فتنہ قادیانیت کا پردہ چاک کیا۔ان کی اپنی تحاریر میں روشنی میں فتنہ قادیانیت کے نمودار ہونے کے بعد کچھ وقت ہمیں علامہ کی شخصیت میں ایسا ملتا ہے جہاں اُن کا فکری رجحان مرزا غلام احمد قادیانی کے بنائے باطل نظام کی طرف رہا بعد ازاں دیگر عوامل کے ساتھ پروفیسر محمد الیاس برنی کہ شہرہ آفاق تصنیف ''قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'' نے مہمیز کا کام کیا اور علامہ مکمل طور پر فتنہ قادیانیت کے خلاف اپنی خداداد صلاحیتوں کو صَرف کرنے لگے جن پر اُن کا اردو، فارسی کلام شاہد وعادل ہے۔

ہم نے اپنی کاوش ''اوّلیاتِ ختم نبوت'' میں ''قادیانیت کو اقلیتی فرقہ قرار دینے کے مطالبہ میں اوّلیت اقبال اور'' ردقادیانیت پر اوّلین انگریزی خطبات و مقالات'' چند چیزیں حضرت اقبال سے متعلق اس بابت جمع کی ہیں۔

ردقادیانیت پر اقبال کے تاریخی خطوط پہلے بھی مختلف کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ہماری خواہش تھی کہ اقبال پر کچھ کام ہمارے پلیٹ فارم سے ہو تو محققین کی مشاورت سے حضرت اقبال کی حیات میں شائع شدہ خطبات کو منتخب کیا گیا۔ماہر اقبالیات پروفیسر ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

(ڈائریکٹر اقبال اکادمی لاہور) نے ہماری عرضی کو قبولیت بخشی اور ہماری رسائی اقبال کی حیات میں شائع شدہ مکتوبات تک ہوئی۔ برادرم محمد ثاقب رضا قادری (الخیر ریسرچ فورم لاہور) نے نظر ثانی کی، اس طرح یہ ذخیرہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان احباب کی توجہ ضروری چاہتے ہیں جو ان سب حقائق کے باوجود اقبال ابھی تک عقیدہ ختم نبوت کے حوالہ سے اُن کو قادیانی ثابت کرنے پر اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ کام تو قادیانیوں کا ہے۔ آپ کی بڑی تحقیق ہوگی لیکن خدارا اپنی تحقیق کا دھارا موڑ دیئے اور نت نئے فتنوں سے متعلق شائستہ زبان، علمی میدان میں اُمت کو آگاہی کا فریضہ ادا کیجئے۔

(۱)

قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان

قادیانیوں اور راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے درمیان جو تناز، شروع ہوا ہے وہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ہندی مسلمانوں نے حال ہی میں اس اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ میں انگریزوں کے نام ایک کھلا خط لکھوں جس میں اس تنازع کے معاشرتی اور سیاسی مضمرات کی وضاحت کی جائے لیکن بدقسمتی سے میری صحت نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ تاہم فی الوقت ایسے معاملے پر چند لفظ کہنے میں مسرت محسوس کرتا ہوں جو میرے خیال میں ہند کے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ میں ابتداء میں ہی اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی دینیاتی استدلال میں پڑنا نہیں چاہتا نہ ہی میں تحریک قادیانیت کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اول الذکر میں ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی جن کے لیے یہ بیان ترتیب دیا جا رہا ہے۔ مؤخر الذکر کے لیے ابھی ہند میں وقت نہیں آیا۔ میرا نقطہ نظر عام تاریخ اور تقابل مذہب کے ایک طالب علم کا سا ہے۔

ہند بہت سے مذاہب سے متعلق فرقوں کی سرزمین ہے اور اسلام ایک مذہبی فرقہ ہے نسبتاً عمیق تر اعتبار سے ان فرقوں کے مقابلے میں جن کے ڈھانچے کا تعین ہوتا ہے کچھ مذہب کے نقطہ نظر سے اور کچھ تخیل نسل کی بنیاد پر۔ اسلام نسل کے تخیل کو کلیتاً مسترد کرتا ہے اور اپنی اساس صرف مذہب پر استوار کرتا ہے۔ چونکہ اسلام خود کو صرف مذہب پر مبنی تصور کرتا ہے، ایک ایسی بنیاد جو تمام تر روحانی ہے اور نتیجتاً خونی رشتوں سے زیادہ ملکوتی ہے، مسلم معاشرہ قدرتی طور پر ان قوتوں کے خلاف زیادہ حساس ہے جنھیں وہ اپنی سالمیت کے لیے ضرر رساں سمجھتا ہے۔ کوئی مذہبی معاشرہ جو تاریخی اعتبار سے اسلام کے بطن سے جنم لیتا ہے، جو اپنی بنا کے طور پر ایک نئی رسالت، پیغمبری کا مدعی ہے اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتا ہے جو اس کی مبینہ وحیوں کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اسے اسلام کی یک جہتی کے لیے ایک سنگین خطرہ تصور

کرنا چاہیے۔ یہ لازماً اس لیے ہونا چاہیے چونکہ مسلم معاشرے کی سالمیت کا سارا تصور ختم رسالت کے نظریے سے اخذ کیا گیا ہے۔

ختم المرسلینی کا نظریہ بنی نوع انسان کی ثقافتی تاریخ میں اغلباً بے حد اصلی (طبعزاد) تصور ہے۔ اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مغرب اور وسطی ایشیا میں ما قبل اسلام مجوسی ثقافت کا بکمال احتیاط مطالعہ کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کی رو سے مجوسی ثقافت زرتشتی، یہودی، یہودیانہ عیسائیت، کلدانی اور سبتی مذاہب پر محیط ہے۔ ان نظریاتی فرقوں کے لیے تسلسل رسالت کا نظریہ لازمی تھا۔ نتیجتاً یہ لوگ بعد ازاں مسلسل توقع کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ بھی عین اغلب ہے کہ یہ مجوسی وغیرہ نفسیاتی طور پر اس امید اور توقع کی زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوں۔ جدید انسان پرانے زمانے کے مجوسیوں کے مقابلے میں روحانیت سے زیادہ بے نیاز ہوتا ہے۔ مجوسی رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرانے فرقے درہم برہم ہو گئے اور ہر قسم کے مذہبی طالع آزماؤں کے ذریعہ سے نئے نئے فرقے معرض وجود میں آتے گئے۔ جدید علام اسلام میں جاہ طلب اور نیم جاہل ملائیت نے جدید طباعتی سہولتوں کا ناروا فائدہ اٹھایا اور نہایت بے حیائی سے ما قبل اسلام قدیم مجوسی نظریات کو بیسویں صدی کے علی الرغم مسلط کرنے کی کوشش کی۔ یہ بدیہی بات ہے کہ اسلام جو دنیا کے مختلف فرقوں کے بہت سے اور دانوں کو ایک ہی تسبیح میں پرو دینے کا دعویدار ہے ایسی تحریک کو کس طرح قبول کر سکتا تھا جو اس کی اپنی سالمیت کے لیے خطرہ ہو اور انسانی معاشرے کو مزید تقسیم کر دینے کا وعدہ کرتی ہو۔

ما قبل اسلام مجوسیت کے جدید احیا کی دو شکلوں (بہائیت اور قادیانیت) میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہائیت، قادیانیت کے مقابلے کہیں زیادہ دیانت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اول الذکر علی الاعلان اسلام سے علیحدگی اختیار کرتی ہے جبکہ مؤخر الذکر اسلام کے بعض زیادہ اہم خارجی شواہد سے چمٹی رہتی ہے در آنحالیکہ اس کا باطن اسلام کی روح اور اس کی تمناؤں کے سراسر خلاف اور دشمنی سے مملو ہے۔ اس کے ہاں خدا کا تصور جس کی تحویل میں اپنے مخالفوں کے لیے زلزلوں اور طاعون کے غیر مختتم ذخیرے موجود ہیں یہودیت کے عنصر کا حامل ہے کہ آسانی سے اس تحریک کو قدیم یہودیت کی جانب مراجعت کرنے والی تحریک سمجھا جا سکتا ہے۔ روح مسیح کے تسلسل کا تصور

زیادہ تر یہودی تصوف سے متعلق ہے بمقابلہ مثبت یہودیت کے۔ پروفیسر بوبر جنھوں نے پولینڈ کے مسیح باشیم کا تذکرہ ہم تک پہنچایا ہے کہتے ہیں "یہ خیال کیا جاتا تھا روح مسیح پیغمبروں کے توسل سے زمین پر اتری اور مقدس لوگوں کی ایک طویل صف جس کی طنابیں موجودہ زمانے تک کھنچی ہوئی ہیں۔ ما قبل اسلام مجوسی ملحدانہ تحریکوں کے زیر اثر "بروز"، "حلول"، اور "ظل"، جیسے الفاظ ایجاد کیے گیے تاکہ پیہم تخلیق مسیح کے عمل کی توثیق ہوتی رہے۔ یہ بھی از بس ضروری تھا کہ مجوسی نظریے کی توضیح کی غرض سے نئی نئی اصطلاحات وضع کی جائیں تاکہ مسلم ضمیر کے لیے کم سے کم برہم کن ثابت ہوں۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ یہ ایک ناجائز اظہار ہے جس کی ابتدا ما قبل اسلام مجوسی نظریے کی رہین منت ہے۔ ہمیں یہ (اصطلاح) ابتدائی اسلامی دینی اور تاریخی ادب میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس قابل ذکر حقیقت کا انکشاف بھی پروفیسر دین سنک کی کتاب "احادیث رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں مطابقت" سے ہوا جو احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین ابتدائی ترین تاریخی دستاویزات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانے والی بات ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس اصطلاح کو کیوں کبھی بھی استعمال نہ کیا۔ یہ اصطلاح انھیں اس لیے اچھی نہ لگی کہ اس میں تاریخی عمل کا ایک غلط تصور پنہاں تھا۔ مجوسی ذہن زماں کو ایک گول دائرے میں حرکت پر قیاس کرتا تھا۔ بحیثیت ایک پیہم تخلیقی عمل کے تاریخی عمل کی درست وضاحت کرنے کا سہرا تو اسلامی مفکر اور مورخ ابن خلدون کے سر بندھا تھا۔

لہٰذا قادیانی تحریک کی مخالفت میں ہندی مسلمانوں کے جذبات کی یہ شدت جاری عمرانیات کے طالب علم کے لیے بالکل قابل فہم ہوگی۔ اوسط درجہ کا مسلمان جس کے بارے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک لکھنے والے نے کہا کہ اس کے اعصاب پہ ملّا ہے سوار، کی اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہونے کی وجہ زیادہ تر اپنی حفاظت کی حس تھی بجائے اپنے عقیدے میں تصور ختم نبوت کے مکمل تر مفہوم کے ادراک کے۔ نام نہاد روشن خیال مسلمانوں نے اسلام میں ختم المرسلین کے نظریے کو سمجھنے کی شاذ و نادر ہی کوئی کوشش کی ہوگی اور مغربی ثقافت کی غیر محسوس یلغار نے اسے اپنی حفاظت کی حس سے بھی مزید محروم کر دیا۔ ان میں سے بعض روشن

خیال مسلمان تو اس حد تک چلے گئے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کو رواداری کی تبلیغ کرنے لگے۔ میں سر ہربرٹ ایمرسن (گورنر پنجاب) کو مسلمانوں کو رواداری کا سبق دینے پر تو بآسانی معاف کر سکتا ہوں کہ وہ تو ایک جدید یورپین ٹھہرے جو کلیتاً ایک مختلف تہذیب وتمدن میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اور شاید خود میں وہ بصیرت پروان نہ چڑھا سکے جو کسی کے لیے بھی ایک مختلف ثقافت میں ایسے مسئلے کو سمجھنے کا فہم عطا کر سکے جو اس کے ڈھانچے کے تحفظ کے لیے از بس ضروری ہے۔

ہند میں حالات کہیں زیادہ منفرد نوعیت کے ہیں۔ مذہبی فرقوں کے اس ملک میں جہاں ہر فرقے کے مستقبل کا انحصار اس کی سالمیت پر ہے مغربی قوم کے لوگ حکمران ہیں جو مذہب میں عدم مداخلت کے سوا اور کوئی حکمت عملی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہند جیسے ملک میں اس آزاد اور ناگزیر حکمت عملی کے تکلیف دہ نتائج برآمد ہوئے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ ہند میں برطانوی حکومت کے تحت مسلم فرقے کی سالمیت اس سے کم تر درجے پر ہے جتنی رومن حکومت کے تحت حضرت یسوع مسیح کے زمانے میں یہودی فرقے کو حاصل تھی۔ ہند میں کوئی بھی مذہبی طالع آزما کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے اور استحصال کی خاطر نیا فرقہ تشکیل دے سکتا ہے۔ ہماری اس آزاد حکومت کو اصل فرقے کی سالمیت کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں بشرطیکہ طالع آزما اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیروکار سرکاری محاصل باقاعدگی سے ادا کرتے ہوں۔ اسلام کے بارے میں اس حکمت عملی کو ہمارے عظیم شاعر اکبر الہ آبادی نے صحیح تناظر میں دیکھا جو اپنے معمول کے مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں راسخ العقیدہ ہندوؤں کے اس مطالبے کو بہت سراہتا ہوں کہ نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ درحقیقت یہ مطالبہ سب سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے ہونا چاہیے تھا جو ہندوؤں کے برعکس اپنے ڈھانچے سے نسل کے تصور کو کلیتاً مسترد کرتے ہیں۔ حکومت کو موجودہ صورت حال پر نہایت متانت کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو یہ

کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایک اوسط درجے کے مسلمان کی ذہنیت کو سمجھے جو اس ضمن میں اپنے فرقے کی سالمیت کے لیے اسے بے حد اہم گردانتا ہے۔ بہرکیف اگر کسی فرقے کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو اس فرقے کے سامنے جو واحد راستہ رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انتشار کی قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرے۔ اور اپنے تحفظ کے کیا طریقے ہیں؟

متنازع فیہ تحریریں، اور اس شخص کے دعویٰ کی تردید جسے موجودہ فرقہ ایک مذہبی طالع آزما گردانتا ہے۔ ان حالات میں کیا موجودہ فرقے کو رواداری کا درس دینا مناسب ہے جس کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو اور باغی گروہ کو اپنا پروپاگنڈا کرنے کی اجازت دینا بالخصوص جب کہ پروپاگنڈا گالیوں سے پر ہو؟

اگر ایک گروہ، جس نے اصل فرقے کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہو، اگر حکومت کے لیے کچھ خاص خدمات پیش کر رہا ہو تو مؤخر الذکر کو ان خدمات کا جتنا وہ چاہے معاوضہ ادا کرنے کی آزادی حاصل ہے اور دیگر فرقوں کو اس کا مطلق ملال نہ ہوگا۔ لیکن یہ توقع کرنا تو بہت ہی بڑی زیادتی ہوگی کہ اصل فرقہ خاموشی کے ساتھ ان قوتوں کو نظرانداز کرتا رہے جو سنگین طریقے سے اس کی اجتماعی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے درپے ہوں۔ اجتماعی زندگی بھی خطر تحلیل سے اسی طرح متاثرہوتی ہے جس طرح انفرادی زندگی۔ اس بارے میں اس امر کے اضافے کی حاجت نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان باہمی دینیاتی بحثا بحثی سے اہم اصول متاثر نہیں ہوتے کہ ان اختلافات کا تعلق تفصیلات سے ہے ایک دوسرے پر الزام دھرنے کے باوصف۔

ایک نکتہ اور ہے جو حکومت کے خصوصی غوروفکر کا متقاضی ہے۔ ہند میں مذہبی طالع آزماؤں کی جدید آزاد روی کی بنیاد پر حوصلہ افزائی سے لوگ مذہب سے زیادہ سے زیادہ بے گانہ ہوتے جائیں گے اور اس طرح ہند کے فرقوں کی زندگی سے آخرکار مذہب کا اہم عنصر بالکل معدوم ہو جائے گا۔ ہندی ذہن پھر مذہب کا کوئی اور نعم البدل تلاش کرے گا جو ملحدانہ مادیت پرستی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے جو روس میں ظاہر ہو چکی ہے۔

مگر مذہبی مسئلہ ہی وہ واحد مسئلہ نہیں ہے جو اس وقت مسلمانان پنجاب کے ذہنوں میں خلفشار پیدا کر رہا ہے۔ سیاسی نوعیت کے کچھ اور جھگڑے بھی ہیں جن کی جانب سر ہربرٹ ایمرسن

نے میری دانست میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارے کیے۔ بلاشبہ ان کی نوعیت خالصتاً سیاسی ہے۔لیکن یہ بھی اسی طرح مسلمانان پنجاب کے اتحاد کو اسی سنگینی کے ساتھ متاثر کرتے ہیں جس طرح مذہبی مسئلہ کرتا ہے۔مسلمانان پنجاب کے اتحاد کے ضمن میں حکومت پنجاب کے اضطراب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اس سے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ذرا سا اپنے گریبان میں بھی جھانک لیجیے۔میں پوچھتا ہوں، دیہی اور شہری مسلمانوں میں تمیز قائم کرنے کا کون ذمہ دار ہے۔ یہ ایسی تمیز ہے جس سے مسلم فرقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا اور دیہی گروہ متعدد ذیلی گروہوں میں بٹ گئے جو ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار رہتے ہیں؟

سر ہربرٹ ایمرسن مسلمانان پنجاب میں مناسب قیادت کے فقدان کا دکھڑا روتے ہیں لیکن کاش وہ یہ محسوس کرتے کہ حکومت نے جس دیہی اور شہری تمیز کو جنم دیا ہے اور جسے جاہ پرست سیاسی طالع آزماؤں کے توسل سے برقرار رکھا ہوا ہے جن کی نظریں اپنے ذاتی مفادات پر لگی رہتی ہیں پنجاب میں اتحاد اسلام کی بجائے اس (بیماری) نے فرقے کو پہلے ہی حقیقی رہنما پیدا کرنے کے نا اہل بنا دیا ہے۔مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترکیب اس خواہش کا ماحصل ہے کہ اصلی قیادت کے ابھرنے کو ناممکن بنا دیا جائے۔سر ہربرٹ ایمرسن تو مسلمانوں میں قیادت کے فقدان پر اظہار تاسف کرتے ہیں اور میں حکومت کی طرف سے ایسے نظام کو جاری و ساری رکھنے پر افسوس ظاہر کرتا ہوں جس نے صوبے میں صحیح قیادت کے ابھرنے کی جملہ امیدوں کا خون کر دیا ہے۔

عبارت مابعد

میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان سے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میں نے نہایت لطیف انداز میں حکومت کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ طاقت کے بل پر قادیانی تحریک کو کچل دے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے یہ بات واضح کی ہے کہ مذہب میں عدم مداخلت کی حکمت عملی وہ واحد حکمت عملی ہے جسے ہند کے فرمانروا اختیار کر سکتے

ہیں۔کوئی اور حکمت عملی ممکن ہی نہیں۔تاہم میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرے خیال میں یہ حکمت عملی مذہبی فرقوں کے مفادات کے لیے ضرر رساں ہے لیکن اس سے فرار کی کوئی راہ نہیں۔جن پر اس کی زد پڑتی ہے انھیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب ذرائع استعمال کرنا ہوں گے۔میری رائے میں ہند کے حکمرانوں کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ فرقہ قرار دے دیں۔ یہ قادیانیوں کی اپنی حکمت عملی سے بھی مطابقت رکھے گا اور ہندی مسلمان انھیں ایسے ہی گوارا کرلے گا جیسے وہ دیگر مذاہب کو برداشت کرتا ہے۔

(۲)

دی لائٹ وغیرہ کے جواب

(متذکرہ بالا بیان پر تنقید کرتے ہوئے ایک قادیانی ہفت روزہ لائٹ نے لکھا ’’دیگر عظیم مفکروں کی طرح وہ (ڈاکٹر اقبال) بھی اس بات کے قائل نہیں کہ وحی یا الہام کے ذریعہ انسان کی خدا سے لفظاً گفتگو ہو‘‘ جب ایک اخباری نمائندے نے اس الزام کے بارے میں ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا):

لائٹ نے اپنی اس الزام کی بنا ایک اردو شعر پر استوار کی ہے:

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سیدھی سادی اردو ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں زبانی ہم کلامی سے بھی اعلیٰ وارفع مرحلہ ہے۔ لیکن اس شعر کا دینیاتی نظریے کے وحی یا الہام کے تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے لیے میں لائٹ کی توجہ اپنے خطبات (انگریزی متن مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۴ئ) کی جانب مبذول کرواؤں گا جس میں میں نے صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے:

’’لہٰذا یوں وہ قدیم نزاع بھی جس کا تعلق وحی باللفظ سے ہے اور جس نے ایک زمانے میں الٰہیین اسلام کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈال رکھا تھا حل ہو جاتا ہے۔ غیر واضح احساس کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا اظہار فکر کے پیرائے میں کرے، رہا فکر تو وہ خود اپنے وجود سے اپنا مرئی پیکر تلاش کر لیتا ہے لہٰذا یہ کہنا کوئی استعارہ نہیں کہ فکر اور لفظ بیک وقت احساس کے بطن سے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ منطقی فہم ان کی زمانی ترتیب کو دیکھتا ہے اور یوں انھیں ایک دوسرے سے الگ ٹھہراتے ہوئے اپنے لیے طرح طرح کی مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔ بہر حال ایک لحاظ سے الفاظ بھی وحی ہوتے ہیں‘‘

(جب ان سے اس حدیث کے بارے میں استفسار کیا گیا جس کا لائٹ نے حوالہ دیا کہ ہر

صدی کے آغاز پر مجدد نمودار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔

''مدیر لائٹ نے ایسی حدیث کا حوالہ دیا جو ریاضیاتی اعتبار سے ایک تاریخی عمل کی ٹھیک ٹھیک عکاسی کرتی ہے جب کہ میں ایک شخص کی روحانی قوت کا قائل ہوں اور اس بات کا بھی کہ روحانیت سے سرشار انسانوں کی پیدائش کا امکان بھی ہے۔ مجھے اس کا یقین نہیں کہ تاریخی عمل ریاضیاتی اعتبار سے اس قدر ٹھیک ٹھیک ہوتا ہے جیسا کہ (مدیر) لائٹ سمجھتے ہیں۔ ہم بہ آسانی اس امر کا اعتراف کرسکتے ہیں کہ تاریخی عمل کی نوعیت کو سمجھ لینا ہمارے فہم و ادراک سے ماورائ ہے۔ منفی انداز میں میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے ایسا نہیں لگتا کہ یہ ریاضیاتی طور سے اتنا ٹھیک ٹھیک ہوسکتا جیسا کہ لائٹ خیال کرتا ہے۔ میں خود کو ابن خلدون کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر زیادہ راغب پاتا ہوں کہ تاریخی عمل ایک آزاد تخلیقی تحریک ہوتی ہے اور ایسا عمل نہیں ہوتا جس کی راہ اور سنگ ہائے میل پہلے سے متعین کیے جاچکے ہوں۔ جدید زمانے میں اس رائے کا اظہار برگساں نے ابن خلدون کے مقابلے میں زیادہ وضاحت اور سائنسی صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لائٹ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اسے غالباً جلال الدین سیوطی نے ذاتی مفاد میں عام کیا تھا اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا ان دو کتابوں صحیح بخاری اور مسلم میں بھی کوئی ذکر نہیں جنھیں بہت زیادہ مستند تصور کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض روحانی شخصیتوں کا تاریخی عمل کی نوعیت کا رویا ہو لیکن افراد کے ذاتی رویا تو منطقی استدلال کی اساس نہیں بن سکتے۔ یہ ایسا ضابطہ ہے جسے ماہرین احادیث نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔''

(جب ان سے دریافت کیا گیا کہ انھوں نے سن رائز میں شائع شدہ وہ مکتوب دیکھا ہے جس میں مکتوب نگار نے ان کے ایک لیکچر کا حوالہ دیا اور ان پر تضاد بیانی کا الزام لگایا ہے تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔ ''جی ہاں''۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس محولہ بالا لیکچر کی کوئی نقل موجود نہیں نہ اصل انگریزی میں اور نہ ہی اس کے اردو ترجمے میں جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ لیکچر ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل دیا گیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرلینے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوسکتا کہ ربع صدی قبل مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات تھیں۔ اس سے قبل بھی ممتاز فاضل مسلم مصنف مولوی چراغ علی (اسلام پر متعدد کتابوں کے مصنف) نے بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ براہین احمدیہ نامی کتاب میں بیش قیمت اضافے کیے لیکن کسی بھی مذہبی تحریک کے حقیقی مشمولات اور اس کی اصل غرض و

غایت ایک دن میں تو منکشف نہیں ہو جاتیں۔ان کے منصہ شہود پر آنے میں قرن ہا قرن لگتے ہیں۔تحریک کے دو حلقوں کے مابین اندرونی جھگڑوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ جن لوگوں کا بانی تحریک سے ذاتی ربط تھا انھیں بھی تحریک کے مالہ وماعلیہ کے بارے میں کماحقہ علم نہیں تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر تحریک کیا رخ اختیار کرے گی۔ذاتی طور پر میرے لیے تحریک اس وقت مشتبہ ہو گئی جب قطعی طور سے ایک نئی رسالت کا دعویٰ کیا گیا جو بانی اسلام کی رسالت سے بھی اعلیٰ و ارفع تھی اور باقی عالم اسلام کو کافر قرار دے دیا گیا۔بعد ازاں جب میں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک رکن کو رسول اکرم ﷺ کے بارے میں سوقیانہ زبان استعمال کرتے سنا تو میرے شبہات بغاوت میں تبدیل ہو گئے۔آپ انھیں ان کی جڑوں کے حوالے سے نہیں جانیں گے بلکہ انھیں پہچانیں گے ان کے ثمرات کے حوالے سے۔اگر میرا اس وقت کا رویہ میری اپنی تردید کرتا ہے تو یہ تو ایک زندگی اور غور وفکر کرنے والے شخص کا شرف ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر دے۔جیسا کہ ایمرسن نے کہا صرف پتھر اپنے آپ کی تردید نہیں کرتے۔''

(جب ان سے دریافت کیا گیا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد کیا فیضان الٰہی کا امکان باقی ہے اور کیا یہ ممکن ہے کہ فیضان الٰہی سے مملو مصلحین تشریف لائیں تو ڈاکٹر اقبال نے جواب دیا)۔

''میرے لیے آپ کے اس سوال کا جواب دینا اس طرح زیادہ مناسب ہو گا کہ میں آپ کی توجہ اپنے خطبات کی جانب مبذول کرا دوں جن میں صفحہ ۲۱-۲۰ پر میں نے لکھا:

نظریہ خاتمیت .... سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب عقل نے جذبات کو زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا۔ایسی بات نہ ممکن ہے اور نہ پسندیدہ۔اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ باطنی واردات کی خواہ کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو یہ ہمیں یہ حق عطا کرتا ہے کہ ہم ایک آزاد تنقیدی رویہ اور یہ عقیدہ اپنا لیں کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے علم کا سرچشمہ مافوق الفطرت ہے اور یہ کہ اس نوعیت کے دعویٰ کا حق بنی نوع انسان کی تاریخ سے ختم ہو چکا ہے۔اس نوع کا عقیدہ دراصل ایک نفسیاتی قوت ہے جو اس طرح کے استحقاق کو پنپنے سے روکتا ہے۔اس تصور کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کی باطنی واردات کی دنیا میں علم کے نت نئے راستوں کے در وا کر دے۔عین جس طرح کلمہ اسلام کے پہلے نصف جزو نے انسان کو یہ نظر بخشی کہ وہ خارج سے

متعلق اپنے محسوسات اور تجربات کا مطالعہ تنقیدی نقطہ سے کرے اور مظاہر فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے احتراز کرے جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا طریقہ کار تھا۔لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ اس کی نوعیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو بالکل قدرتی واردات تصور کریں اور ان پر اسی طرح تنقیدی نظر ڈالیں جیسا کہ وہ انسانی تجربات کے دیگر پہلوؤں پر ڈالتے ہیں۔ یہ خود رسول اکرم ﷺ کے اپنے رویے سے بھی ظاہر ہے جو انھوں نے ابن صیاد کے نفسیاتی تجربے کے ضمن میں اختیار فرمایا تھا۔اسلام میں دراصل تصوف کا مقصد باطنی واردات کو باقاعدگی کی شکل دینا تھا اگرچہ اس امر کا اعتراف ہونا چاہیے کہ یہ صرف ابن خلدون واحد مسلمان تھے جنھوں نے اس موضوع پر خالصتاً علمی انداز میں کوشش کی۔

ابتدائی جملے سے یہ واضح طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی اعتبار سے خدا رسیدہ بزرگ، (ولی اللہ) یا وحی الٰہی کردار کے لوگ ہمیشہ دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔آیا مرزا صاحب کا تعلق اس قبیلے کے لوگوں سے تھا یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ درحقیقت جب تک بنی نوع انسان کی روحانی قوت ساتھ دیتی ہے انسان کو زندگی کے بہت آدرش سکھانے کے لیے جملہ اقوام وملل میں اس طرح کے لوگ نمودار ہوتے رہیں گے۔اس کے برعکس سوچنا انسانی تجربے کا منہ چڑانے کے مترادف ہوگا۔فرق صرف اتنا سا ہے کہ جدید انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے صوفیانہ تجربات کا تنقیدی جائزہ لے لے۔ دیگر امور کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی زندگی میں جملہ ذاتی اختیارات ختم ہو چکے ہیں جن کے انکار سے انسان مردود وملعون ٹھہرے۔"

(جب ان سے پارسی مسٹر ڈنشا کے مکتوب مطبوعہ اسٹیٹس مین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ڈاکٹر اقبال نے کہا)۔"مجھے اس ضمن میں کچھ نہیں کہنا ماسوا اس کے کہ میں ان سے پوری طرح سے متفق ہوں جہاں تک ان کے بڑے نظریے کا تعلق ہے کہ تاریخ اسلام کے داخلی اورخارجی پہلوؤں کے ضمن میں فارسی عناصر نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ فارسی اثر اس درجہ وسیع ہے کہ اسلام پر مجوسیت کی پپڑی دیکھ کر اسپینگلر تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ اسلام بھی ایک مجوسی دین ہے۔اپنے خطبات میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے مجوسیت کی ان پپڑیوں کو یکسر اتار پھینکوں اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی (کتاب) تعارف مطالعہ قرآن کریم

میں اس ضمن میں مزید کام کر سکوں گا۔ مجوسی فکر اور مذہبی واردات بڑی حد تک مسلم دینیات، فلسفہ اور تصوف میں جذب ہو گئے۔ درحقیقت اس امر کی شہادت موجود ہے کہ تصوف کے بعض مکاتب نے جو اسلامی مکاتب کی حیثیت سے معروف ہیں اصلاً مجوسی نوع کے مذہبی تجربے کا اعادہ کیا ہے۔ میں مجوسیت کو بھی دیگر انسانی تہذیب کی اصناف کی طرح ایک ثقافتی صنف گردانتا ہوں اور میں نے اس لفظ کو تہمت یا بہتان کے طور پر ہرگز استعمال نہیں کیا۔ اس کے اپنے قطعی تصورات تھے، اس کے فلسفیانہ مباحث تھے، اس کی سچائیاں اور اس کی غلطیاں تھیں۔ لیکن جب کوئی ثقافت زوال کا شکار ہونا شروع ہو جاتی ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث اس کے تصورات اور مذہبی تجربے کی اشکال جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی تہذیب اپنی تاریخ کے اس دور میں تھی جب اسلام منصہ شہود پر جلوہ افروز ہوا اور تاریخ تہذیب کے میرے مطالعے کے مطابق اس تہذیب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ خود قرآن کریم میں اس بات کی قطعی شہادت موجود ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلام کا ارادہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر بلکہ مذہبی تجربے کے لیے بھی نئی راہیں کھول دے۔ ہم نے مجوسیت سے جو ورثہ پایا اس نے حیات اسلام کا جیتے جی گلا گھونٹ دیا اور اس کی اصل روح، تمناؤں اور آرزوؤں کو نشوونما نہ پانے دیا۔“

(۳)

اسٹیٹس مین کے نام ایک مکتوب

(روزنامہ اسٹیٹس مین نے قادیانیت اور راسخ الاعتقاد مسلمان، ڈاکٹر اقبال کا بیان شائع کیا اور اس کے ساتھ ہی پہلے اداریے میں اس پر تنقید شائع کی۔ حسب ذیل مکتوب اس تنقید کے جواب میں لکھا گیا جو اسٹیٹس مین نے اپنی ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں شائع کیا)۔

میں آپ کے تنقیدی اداریہ کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں جو ۱۴ر مئی کی اشاعت میں شائع ہوا۔ آپ نے اپنے اداریے میں جو سوال اٹھایا ہے وہ بہت اہم ہے اور مجھے حقیقتاً مسرت ہے کہ آپ نے یہ سوال اٹھایا۔ میں نے اپنے بیان میں اس سوال کو اس لیے نہیں اٹھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب سے اس خیال نے جنم لیا ہے کہ متبادل نبوت کی بنیاد پر ایک نئے فرقے کی تعمیر ہونی چاہیے قادیانی مسلسل مذہبی اور معاشرتی امور میں علیحدگی پسند حکمت عملی پر کار بند ہیں اور اس تحریک کے خلاف مسلمانوں کے جذبات میں شدت کے پیش نظر خود حکومت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں میں اتنے بڑے بنیادی فرق کو محسوس کرے اور مسلمانان ہند کی جانب سے ایک رسمی عرضداشت کا انتظار کیے بغیر اس معاملے میں انتظامی مداخلت کرے۔ اس ضمن میں حکومت کے سکھ فرقے کے بارے میں رویے سے کہ ۱۹۱۱ء تک انتظامی طور سے انھیں ایک علیحدہ سیاسی وحدت تصور نہیں کیا جاتا تھا اور بعد ازاں اسے سمجھا جانے لگا، بغیر سکھوں کی جانب سے کسی رسمی عرضداشت اور لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے علی الرغم کہ سکھ ہندو ہیں میرے احساسات کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

تاہم اب جب کہ آپ نے یہ سوال اٹھا ہی دیا ہے تو اس معاملے کے بارے میں چند خیالات پیش کر دوں جنھیں میں برطانوی اور مسلم دونوں نقطہ ہائے نگاہ سے اعلیٰ ترین اہمیت کا حامل سمجھتا ہوں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کی بالکل وضاحت کر دوں کہ میں کیا، کب اور کہاں کسی ایک فرقے کے مذہبی اختلافات کے بارے میں حکومت کی مداخلت کو برداشت کر سکتا

ہوں۔ مجھے عرض کرنے دیجیے۔

اوّل: اسلام ناگزیر طور پر ایک مذہبی فرقہ ہے جس کی حدود متعین ہیں۔ توحید الٰہی پر ایمان، جملہ رسولوں پر ایمان اور محمد ﷺ کی ختم نبوت پر ایمان۔ ایمان کا آخر الذکر حصہ دراصل وہ عنصر ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان حد فاصل کا تعین کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے کی استعداد بخشتا ہے کہ کوئی شخص، گروہ یا فرقے کا حصہ ہے یا نہیں۔ مثلاً براہمو خدا کو مانتے ہیں۔ وہ محمد ﷺ کو خدا کے پیغمبروں میں سے ایک سمجھتے ہیں تاہم انھیں مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ قادیانیوں کی طرح رسولوں کے ذریعہ سے تسلسل وحی کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کہ وہ محمد ﷺ کی ختم نبوت کے قائل نہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اسلام کے کسی فرقے نے اس حد فاصل کو عبور نہیں کیا۔ فارس (اب ایران) کے بہائیوں نے علی الاعلان نظریہ خاتمیت کو مسترد کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ایک نیا فرقہ ہیں اور لفظ کے اصطلاحی اعتبار سے وہ ''مسلمان'' نہیں ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت ایک مذہب کے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو وحیاً نازل کیا لیکن ایک معاشرے یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسول اکرم ﷺ کی ذات بابرکات کا رہین منت ہے۔ میری دانست میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے کھلے ہیں: یا صاف طریقے سے بہائیوں کی تقلید کریں یا اسلام میں نظریہ خاتمیت (ختم نبوت) کے بارے میں اپنی تعبیرات کو ترک کر دیں اور اس نظریے کو اس کے جملہ مضمرات سمیت قبول کر لیں۔ ان کی عیارانہ تعبیرات محض ان کی اسلام کے زمرے میں رہنے کی خواہش کا نتیجہ ہے تاکہ وہ بدیہی طور سے اس کے سیاسی فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہیں۔

دوم: ہمیں قادیانیوں کی اپنی حکمت عملی اور عالم اسلام کی جانب ان کے رویے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے اپنے پدری فرقے کو پھٹے ہوئے دودھ کا نام دیا جب کہ اپنے مقلدوں کو تازہ دودھ سے تعبیر کیا اور مؤخر الذکر کو انتباہ کیا کہ وہ اول الذکر کے ساتھ میل جول نہ رکھیں۔ مزید، ان کا مبادیات سے انکار، خود کو ایک فرقے کے طور سے احمدیوں کا نام دینا اسلام کی اجتماعی عبادات میں شمولیت نہ کرنا ان کا شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں کا سماجی مقاطعہ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا پورے عالم اسلام کو کافر قرار دینا، یہ تمام چیزیں خود

قادیانیوں کی جانب سے اعلان علیحدگی پر دلالت کرتی ہیں۔ دراصل متذکرہ بالا حقائق سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندومت سے کیونکہ سکھ کم سے کم ہندوؤں میں شادی بیاہ تو کرتے ہیں اگرچہ وہ ہندو مندروں میں عبادت نہیں کرتے۔

سوئم: یہ معلوم کرنے کے لیے کہ قادیانیوں کا مذہبی اور سماجی لحاظ سے علیحدگی کی حکمت عملی پر کاربند رہنے کے باوصف وہ سیاسی اعتبار سے اسلام کے زمرے میں شامل رہنے پر کیوں مصر ہیں، کسی خصوصی ذہانت کی حاجت نہیں۔ اسلامی زمرے میں رہنے کے باعث سرکاری ملازمتوں کے شعبے میں سیاسی فوائد حاصل ہونے سے قطع نظر یہ بدیہی بات ہے کہ ان کی آبادی کے پیش نظر (گزشتہ مردم شماری کے مطابق یہ صرف ۵۶ ہزار تھی) وہ ملک کی کسی بھی مقننہ میں ایک نشست کے بھی حقدار نہیں اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت بھی نہیں سمجھا جا سکتا اس اعتبار سے جس اعتبار سے آپ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ قادیانیوں نے خود کو ایک علیحدہ سیاسی وحدت کے طور پر تسلیم کرانے کا مطالبہ نہیں کیا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی آبادی کے لحاظ سے ملک کے کسی بھی قانون ساز ادارے میں نیابت کے مستحق قرار نہیں پاتے۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا اہتمام موجود ہے۔ میری رائے میں یہ واضح ہے کہ علیحدگی کے ضمن میں حکومت سے مطالبہ کرنے کے بارے میں قادیانی کبھی پہل نہیں کریں گے۔ مسلم فرقہ یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہو گا کہ انھیں فوری طور پر پوری فرقے سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت فی الفور اس مطالبہ پر کان نہیں دھرتی تو ہندی مسلمانوں کو یہ شبہ دامن گیر ہو جائے گا کہ برطانوی حکومت نئے مذہب کو داشتہ آید بہ کار کے طور سے ذخیرہ کرنا چاہتی ہے اور علیحدگی میں تاخیر روا رکھ رہی ہے، ان کی تھوڑی تعداد کی وجہ سے صوبے میں چوتھے فرقے کی موجودہ ناقص کارکردگی مقامی مقننہ میں مسلمانان پنجاب کی برائے نام اکثریت کو موثر طریقے سے نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے۔ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی جانب سے کسی رسمی مطالبے کا انتظار نہیں کیا تھا، اب وہ قادیانیوں کی طرف سے ایک رسمی عرضداشت کا کیوں انتظار کرے؟

(۴)

رومن حکومت کے تحت یہودی سالمیت

''پندرہ روزہ اسلام'' (قادیانی جریدہ) کے نمائندہ خصوصی نے ڈاکٹر سر محمد اقبال سے دریافت کیا کہ کیا قادیان کے مرزا بشیرالدین محمود نے حالیہ خطبہ جمعہ کے دوران ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی جسے ایک قادیانی جریدہ ''سن رائز'' نے اس طرح شائع کیا:

''انھیں (ڈاکٹر اقبال کو) حکومت کے خلاف ایک شکایت ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ انگریز اتنے دانشمند بھی نہیں جتنے یسوع مسیح کے زمانے میں رومن تھے کیونکہ آخر کار رومنوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا تھا۔ اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جارہی ہے کہ انھوں نے اپنی حاکمیت کو بالائے طاق رکھ کر یسوع مسیح کو یہودیوں کے حوالے کر دیا تھا مؤخر الذکر کے جنونی شور شرابے سے متاثر ہونے کے بعد''

ہمارے نمائندہ خصوصی نے کہا کہ میں آپ کی خصوصی توجہ متذکرہ بالا عبارت میں ''رومنوں کی کارروائی کی منظوری دی جارہی ہے''، کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ''کیا پیغمبر اسلام کی خاتمیت کے بارے میں آپ کا بیان کچھ عرصہ قبل انڈین اور اینگلو انڈین پریس میں شائع ہوا'' سر محمد اقبال نے کہا)۔

یہ غلط ترجمانی کے قادیانی فن کی ایک مثال ہے کہ مرزا محمود نے میرے بیان میں ایک جملہ پڑھ لیا جس کا وہ حوالہ نہیں دیتا اور جسے میں اس بیان میں تلاش نہ کرسکا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ہی میرے جملے کا روپ دے دیتے ہیں۔ بدیہی بات یہ ہے کہ چونکہ ان کے پاس میرے بیان کے مرکزی خیال کے خلاف کچھ کہنے کو نہ تھا اس لیے اپنے غریب مقلدوں کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے یہ بات کہہ دی اور شاید حکومت کو بھی اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ چونکہ میں یہ باور کرتا ہوں کہ یہودیوں کو رومن حکومت کے تحت اس سے زیادہ بہتر تحفظ حاصل تھا

جتنا کہ ہندی مسلمانوں کو انگریزوں کے تحت حاصل ہے لہٰذا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ میں یہ تصور کرتا ہوں کہ یہودی مذہبی فیصلے کو رومن گورنر نے منظوری عطا کی اور وہ اسے ایک نیک عمل سمجھتا تھا۔ اس سے بری غلط ترجمانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں رومنوں کے بارے میں کوئی اخلاقی فیصلہ صادر کروں۔ میرے بیان میں صورت حال پر خالصتاً سیاسی لحاظ سے نظر ڈالی گئی اخلاقی نقطہ نگاہ سے نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ رومن یہ سمجھتے تھے کہ وہ آئینی اعتبار سے یہودی دینی مجلس کے فیصلوں کو منظور کرنے کے پابند ہیں ان امور میں جنھیں یہودی صحیح یا غلط اپنے معاشرے کے لیے خطرناک تصور کرتے ہوں۔ یسوع مسیح علیہ السلام کے خلاف مقدمے کی اس خصوصی مثال میں بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ رومن ریاست کو یہودیوں کے صومعے یا مذہبی مجلس کے اس شخص کے بارے میں فیصلہ کو تسلیم کرنا پڑا جو ہمارے عقیدے کے مطابق حقیقتاً رسول تھے۔ اگر یہ کسی مذہبی طالع آزما کا معاملہ ہوتا تو کوئی بھی اخلاقی طور پر رومنوں پر الزام نہ دھرتا کہ انھوں نے یہودیوں یا ان کی مذہبی مجلس کے اس فیصلے کو کیوں منظوری عطا کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔ ذاتی طور سے میں اس آئینی تحفظ کی قدر و قیمت کا انکار نہیں کر سکتا جو رومنوں نے یہودیوں کو دے رکھا تھا اگرچہ میں اس تحفظ کی اخلاقی قدر کے بارے میں مختلف رائے رکھتا ہوں۔ یہ عین اغلب ہے کہ کسی دن خود قادیانیوں کو اپنے باغی رسولوں کے خلاف تحفظ کی ضرورت پیش آجائے جن کے بارے میں اسلام کے دینی تصورات کو عامیانہ رنگ دے رکھا ہے جس کی بنا پر پھل پھول رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کسی وقت اتنی قوت فراہم کر سکتا ہے کہ وہ اس فرقے کی موجودہ تنظیم کے لیے خطرہ بن جائے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ ایک فرقہ جس نے اپنی ولادت اور نشو و نما کا تمام تر انحصار ایک جدید ریاست کی آزاد روی پر کیا مذہبی طالع آزماؤں کے خلاف اسلام کے تحفظ کے مطالبے پر خفا ہو۔

قادیانی منطق ایک بار پھر میرے بیان میں یہ تجویز دیکھتی ہے کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ قادیانی تحریک کو بزور قوت کچل دے۔ میں نے اپنے بیان میں یہ بات صاف طریقے سے واضح کی ہے کہ ہند میں مذہبی امور میں عدم مداخلت کی حکمت عملی ناگزیر ہے جو مذہبی فرقوں کا

مسکن ہے۔ میں آزادروی کا مداح نہیں ہوں اور اسے ایسے تخیلات کا مجموعہ سمجھتا ہوں جو انسان کو وہ کچھ بنا دیتے ہیں جو اسے نہیں ہونا چاہیے تاہم میں اس سے بھی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ جدید دنیا میں ایک طاقتور قوت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو مرزا محمود "ناگزیر" کا مطلب نہیں جانتے یا اسے آسانی سے بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔

رومنوں کو چاہیے یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کو ایک نئے فرقے کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے۔ لیکن یہودی معاشرے کو تحفظ دینے کی یہ راہ اس وقت ان کے سامنے کھلی نہ تھی کیونکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں لایا گیا تو اس وقت عملاً ان کے کوئی مقلد نہ تھے۔ تاہم ہند میں برطانیہ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ انتظامی اعتبار سے قادیانیوں کو ایک علیحدہ فرقہ تسلیم کرے۔ میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہوں کہ امن کی منزل کی طرف یہی راہ جاتی ہے۔ نہ ہی قادیانیوں کو ایسے فرقے کا جزو رہنے پر بے قرار ہونا چاہیے جسے وہ فرقہ کفار قرار دیتے ہیں۔

(۵)

اسلام اور احمدیت

کلکتہ کے جریدے ''ماڈرن ریویو'' میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضمون شائع ہونے کے بعد مجھے مختلف مذہبی اور سیاسی مکاتب فکر سے متعلق مسلمانوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں ان خطوں کے لکھنے والوں میں سے بعض نے لکھا ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مزید وضاحت کروں اور مسلمانان ہند کے احمدیوں کے متعلق رویے کا جواز پیش کروں۔ دیگر لوگوں نے مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ احمدیت میں ٹھیک مابہ النزاع مسئلہ کیا ہے؟ اس بیان میں پہلے تو میں ان مطالبات کا جواب دوں گا جو میرے خیال میں بالکل حقیقی ہیں اور پھر میں ان سوالات کے جواب دوں گا جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اٹھائے ہیں۔ تاہم مجھے خدشہ ہے کہ اس بیان کے بعض حصوں میں پنڈت کو دلچسپی نظر نہ آئے گی۔ ان کا وقت بچانے کے لیے میں تجویز کروں گا کہ وہ ایسے حصوں پر سے صرف نظر کرلیں۔ میرے لیے یہ کہنا بالکل غیر ضروری ہے کہ میں پنڈت جی کی دلچسپی کا خیر مقدم کرتا ہوں ایسے معاملے میں جسے میں مشرق یا شاید دنیا کے عظیم ترین مسائل میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ پہلے قوم پرست ہندی رہنما ہیں جنھوں نے عالم اسلام میں موجودہ روحانی اضطراب کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس بے چینی کے بہت سے پہلوؤں اور ممکنہ ردعمل کے پیش نظر یہ پسندیدہ بات ہے کہ غور و فکر کے عادی ہندی سیاسی رہنما اپنے ذہن کے دروازے یہ جاننے کے لیے وا کردیں کہ اس وقت اسلام کا دل کیوں مضطرب ہے۔

میں اس بات کو پنڈت یا اس بیان کے قارئین سے چھپانا نہیں چاہتا کہ پنڈت کے مضامین نے میرے ذہن کو ملے جلے جذبات کا ایک تکلیف دہ تاثر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ وسیع ثقافتی ہمدردیوں کے آدمی ہیں میں یہ قبول کرنے پر آمادہ ہوں کہ انھوں نے جو سوالات اٹھائے ہیں انھیں سمجھنے کی ان کی خواہش بالکل حقیقی ہے تاہم انھوں نے جس انداز سے اظہار

بیان کیا ہے اس سے ایسی نفسیات مترشح ہوتی ہے جسے ان کے ساتھ منسوب کرنا میرے لیے دشوار امر ہے۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ قادیانیت پر میرے بیان سے جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک مذہبی نظریے کو جدید خطوط پر ظاہر کر دیا جائے پنڈت اور قادیانیوں دونوں کو تکلیف پہنچی۔ دونوں داخلی طور پر مختلف وجوہ کی بنا پر مسلمانوں کے بالخصوص ہند میں سیاسی اور مذہبی ہم آہنگی کے امکانات مضطرب ہوئے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ ہندی قوم پرست، جس کی سیاسی مثالیت پسندی نے عملاً اس کے شعور حقائق کو موت کی نیند سلا دیا، یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں حق خودارادیت کا جذبہ بیدار ہو۔ میرے خیال میں وہ یہ غلط سوچتے ہیں کہ ہندی قوم پرستی کے حصول کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک کے ثقافتی وجودوں کو بالکل دبا دیا جائے جن کے باہمی روابط سے ہند میں بہت عمدہ اور دیرپا ثقافت جنم لے سکتی ہے۔ ایسی قوم پرستی، جو اس طرح کے حربوں سے حاصل ہوگی کا مطلب باہمی تلخی اور ظلم وستم کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ یہ بھی بعینہٖ بدیہی بات ہے کہ قادیانی بھی ہندی مسلمانوں میں بیداری کی لہر سے متوحش ہیں کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے سیاسی وقار میں اضافہ ان کے ان عزائم کو ملیامیٹ کر دے گا کہ وہ رسول عربی ﷺ کی امت میں سے ہندی پیغمبر کے لیے ایک نئی امت تشکیل دے سکیں گے۔ میرے لیے یہ کچھ کم حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہ بات ہندی مسلمانوں کے ذہن نشین کرانے کی میری کوشش کہ ان کی ہند میں تاریخ کے اس اہم لمحے میں داخلی یک جہتی از بس ضروری ہے اور انھیں اصلاح کی تحریکوں کے روپ میں انتشار کی قوتوں کے خلاف میرے انتباہ نے پنڈت کو ایسی قوتوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کا موقع فراہم کر دیا۔

تاہم میں پنڈت کی نیت کے تجزیہ کا ناخوشگوار فریضہ مزید انجام دینا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں کے استفادے کی غرض سے جو قادیانیوں کے بارے میں عام مسلمانوں کے رویے کی مزید وضاحت کے خواہاں ہیں میں دیوران کے فلسفے کی کہانی (Durant's Story of Philosophy) سے ایک اقتباس کا حوالہ دوں گا۔ مجھے امید ہے کہ اس سے قادیانیت کے مابہ النزاع مسئلہ کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔ دیوران نے چند جملوں میں عظیم فلسفی اسپینوزا کے جماعت سے اخراج کے بارے میں یہودی نقطہ نظر کا لب لباب بیان کر دیا ہے۔ قاری کو یہ ہرگز

خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس اقتباس کے حوالے میں اسپینوزا اور بانی احمدیت کے مابین کوئی موازنہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ان دونوں کے مابین دانش وبینش اور کردار دونوں کے اعتبار بعد مشرقین ہے"خدامست" اسپینوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ایک نئی تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہیں لاتے وہ صیہونیت کے دائرے سے خارج ہیں۔لہٰذا دیوران کی عبارت کا اطلاق زیادہ شدومد کے ساتھ قادیانیت کے خلاف مسلمانوں کے عام رویے پر ہوتا ہے۔اسپینوزا کے اخراج کے ضمن میں یہودیوں کے رویے پر یہ اقتباس حسب ذیل ہے:

"مزید برآں، بزرگوں کے نزدیک ایمسٹرڈم میں یہودیوں کے چھوٹے سے گروہ کو انتشار و افتراق سے محفوظ رکھنے کے لیے مذہبی اتحاد واحد راستہ تھا اور تقریباً آخری ذریعہ تھا اتفاق کے تحفظ کا اور اسی طرح سے ساری دنیا میں منتشر یہودیوں کی بقا یقینی بنائی جا سکتی تھی۔اگر ان کی اپنی ریاست ہو، اپنا سول قانون، ان کے اپنے نظم ونسق کا لا مذہبی نظام اور وہ قوت جو داخلی طور سے باہمی اتحاد پر مجبور کر سکے اور خارجی اعتبار سے احترام حاصل کر سکے تب ان میں زیادہ رواداری ہو سکتی تھی۔لیکن ان کا مذہب ان کے لیے حب الوطنی بھی ہے اور دین بھی، ان کی عبادت کا، ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا محور بھی ہے اور عبادت کا مرکز بھی اور ان کی بائبل (کتاب مقدس) ان لوگوں کی چلتی پھرتی پدروطن۔ان حالات میں وہ سمجھتے تھے کہ سنی سنائی بات کرنا غداری ہے، رواداری خودکشی کے مترادف ہے۔

ایمسٹرڈم میں یہودی ایک اقلیتی فرقہ تھا۔وہ اسپینوزا کو افتراق برپا کرنے والی قوت قرار دینے میں بالکل حق بجانب تھے جس سے ان کے فرقے کو تہہ و بالا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔اسی طرح سے ہندی مسلمان قادیانی تحریک کو جو عالم اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور ان کا معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے ہند میں اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ بڑا خطرہ گردانتے ہیں بمقابلہ اسپینوزا کی مابعد الطبیعیات کے جو یہودیوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ہو سکتی تھی۔میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہندی مسلمان کو اس کی چھٹی حس خبردار کرتی ہے کہ ہند میں اس کے حالات خاص نوعیت کے ہیں اور قدرتی طور پر وہ انتشار پھیلانے والی قوتوں کے خلاف زیادہ حساس ہے کسی اور ملک کے مسلمانوں کے مقابلے میں۔میرے خیال میں ایک عام مسلمان کا یہ حسیاتی فہم

بالکل درست ہے اور مجھے اس باب میں مطلق شبہ نہیں کہ اس کی ہندی مسلمانوں کے شعور میں عمیق تر بنیاد موجود ہے۔ جو لوگ اس نوع کے معاملے میں تحمل کی بات کرتے ہیں وہ تحمل کا لفظ نہایت بے احتیاطی سے استعمال کرتے ہیں یا پھر مجھے خدشہ ہے کہ وہ لفظ تحمل کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ تحمل کا احساس انسانی ذہن کے مختلف رویوں سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ گبن کہتا ہے:

"تحمل فلسفی کا ہوتا ہے جس کے نزدیک جملہ مذاہب یکساں طور سے سچ ہوتے ہیں، مؤرخ کا ہوتا ہے جس کے نزدیک سب کے سب یکساں طور پر جھوٹے ہوتے ہیں اور سیاستدان کا ہوتا ہے جس کے نزدیک سب کے سب یکساں طور پر مفید ہوتے ہیں۔ پھر ایک شخص کا تحمل ہوتا ہے جو فکر کے دیگر رویوں کو برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ خود فکر کے ان تمام رویوں سے لاتعلق رہا ہوتا ہے۔ کمزور انسان کا تحمل ہوتا ہے جو محض اپنی کمزوری کے سبب سے ان تمام اہانتوں اور ذلتوں کو گوارا کرے جو ان اشیاء اور اشخاص پر ڈھیر کر دی جاتی ہیں جو اسے عزیز ہوں۔"

یہ بدیہی بات ہے کہ اس نوع کے تحمل کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ برعکس ازیں ان سے صریحاً اس شخص کی روحانی ناداری کا اظہار ہوتا ہے جو ان پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ حقیقی تحمل کا ادراک دانش اور روحانی وسعتوں سے ہوتا ہے۔ یہ روحانی اعتبار سے ایک طاقتور انسان کا تحمل ہے جو اپنے دین کی حدود کی حفاظت کے بارے میں فکرمند ہو لیکن اپنے دین کے علاوہ دیگر مذاہب کی جملہ صورتوں کو گوارا کرے بلکہ انھیں سراہے۔ اس نوع کے تحمل کا صرف ایک صحیح مسلمان ہی اہل ہو سکتا ہے۔ اس کا اپنا دین تو امتزاج آمیز ہوتا ہی ہے چنانچہ اسی وجہ سے وہ بآسانی دیگر مذاہب میں ہمدردی اور لائق تعریف اسباب دریافت کر سکتا ہے۔ ہمارے ایک عظیم ہندی شاعر حضرت امیر خسرو اس نوع کے تحمل کا لب لباب ایک بت پرست کی کہانی میں اجاگر کرتے ہیں۔ اس بت پرستی کے شغف کی تفصیل بیان کرنے کے بعد شاعر اپنے مسلمان قارئین سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری
هم زوے آموز پرستش گری

صرف خدا کا عاشق صادق ہی (بتوں سے) والہانہ وابستگی کو سراہ سکتا ہے اگر چہ اس کی

سمت بتوں کی جانب ہے جس پر وہ ایمان نہیں رکھتا۔ ہمیں تحمل کا درس دینے والوں کی حماقت یہ ہے کہ وہ اس شخص کے رویے کو تعصب کا نام دیتے ہیں جو اپنے ایمان کی حدود کی حفاظت قابل رشک حد تک کرتا ہو۔ وہ اس رویہ کو غلط طریقے سے اخلاقی اعتبار سے احساس کمتری کا شکار کہتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ اس کے اس رویے کی قدر و قیمت صریحاً حیاتیاتی ہے۔ جب ایک گروہ کے اراکین یہ محسوس کرتے ہوں، جبلی طور پر یا عقلی استدلال کی بنیاد پر، کہ جس معاشرتی نظم سے وہ متعلق ہیں اس کی اجتماعی زندگی خطرے میں ہے تو ان کے دفاعی رویے کو حیاتیاتی معیار کے حوالے سے ہی پرکھنا چاہیے۔ اس جہت میں ہر فکر یا عمل کو زندگی میں اس کی قدر و قیمت کے تناظر میں ہی دیکھنا ہوگا۔ اس معاملے میں سوال یہ نہیں ہے کہ اس شخص کے بارے میں جسے ملحد یا زندیق قرار دیا جاچکا ہے کسی فرد یا گروہ کا رویہ اخلاقی اعتبار سے اچھا ہے یا برا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حیات بخش ہے یا زندگی کے لیے تباہ کن۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو یہ سوچتے ہیں کہ ایک ایسے معاشرہ کے پاس جس کی بنا مذہبی اصولوں پر اٹھائی گئی لازمی طور سے ایک احتسابی ادارہ بھی ہونا چاہیے۔ یہ عیسائیت کی تاریخ کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن پنڈت کی منطق کے برعکس تاریخ اسلام یہ ثابت کرتی ہے کہ گزشتہ تیرہ سو برس کے دوران مسلم ممالک احتسابی ادارے سے بالکل نا آشنا رہے۔ قرآن کریم اس طرح کے ادارے کی خاص طور پر ممانعت کرتا ہے۔

”دوسروں کی کوتاہیوں کا کھوج مت لگاؤ اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہانیاں نہ پھیلاؤ“ درحقیقت پنڈت تاریخ اسلام کے مطالعے سے یہ جان لیں گے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جنھیں اپنے ملکوں میں مذہب کی بنیاد پر ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا انھیں ہمیشہ عالم اسلام میں ہی پناہ ملی۔ دو باتیں جن پر اسلام کے تصوراتی ڈھانچے کی اساس استوار ہے اس درجہ سہل ہیں کہ وہ کسی کو ملحد قرار دینے کے ضمن میں سنی سنائی باتوں پر قیاس کو تقریباً ناممکن بنا دیتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ وہ ملحدانہ نظریات کا حامل ہے اور وہ نظریات معاشرتی نظام کے شکست وریخت کا باعث بن سکتے ہیں تو ایک آزاد مسلم مملکت یقینا اس کے خلاف کارروائی کرے گی لیکن یہ کارروائی خالصتاً مذہبی ہونے کی بجائے زیادہ تر سیاسی

نوعیت کی ہوگی۔ میں یہ بات بخوبی محسوس کر سکتا ہوں کہ پنڈت جیسا کوئی شخص جو ایسے معاشرے میں پیدا ہوا ہو اور پروان چڑھا ہو جس کی نہ خاص طور سے متعین حدود ہوں اور نہ بدیں وجہ کوئی داخلی یک جہتی ہو وہ یقیناً یہ سمجھنے میں دشواری محسوس کرے گا کہ ایک مذہبی معاشرہ کس طرح پنپ سکتا اور خوش رہ سکتا ہے جب تک کہ لوگوں کے ایمان اور عقائد کے بارے میں حکومت کی جانب سے مقرر کردہ تفتیشی ادارے کے ذریعے تحقیقات نہ کرالی جائیں۔ یہ اس عبارت سے عیاں ہے جس کا وہ کارڈینل نیومین کی جانب سے حوالہ دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ میں کسی حد تک کارڈینل کے اصول کا اسلام پر اطلاق گوارا کرلوں گا۔ اجازت دیجیے کہ میں انھیں بتا دوں کہ کیتھولک ازم اور اسلام کے داخلی ڈھانچے میں زبردست فرق ہے۔ جہاں، جیسا کہ مسیحیت کی تاریخ ظاہر کرتی ہے، پیچیدہ اور غیر معمولی نوعیت کے متعدد عقیدوں نے ہمیشہ ملحدانہ تعبیرات کے امکانات کی نشوونما کی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ دو چیزوں پر مبنی ہے۔ اللہ ایک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک لوگوں کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں جو ہر عہد اور جملہ ممالک کی زندگی بسر کرنے کے درست طریقے کی جانب رہنمائی کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ اگر بعض عیسائی مصنف یہ سمجھتے ہیں کہ ایک راسخ عقیدے کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک انتہائی عقلی قضیہ ہوتا ہے جسے مذہبی سالمیت کے حصول کی خاطر اس کی الہیاتی اہمیت کو سمجھے بغیر قبول کرلیا جائے تو اس اعتبار سے اسلام کے ان دو سہل سے قضیوں کو راسخ عقیدے کے طور پر بھی بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کی پشت پر بنی نوع انسان کا تجربہ موجود ہے اور ان کی حمایت میں عقلی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک بدعتی عقیدے کا تعلق ہے، فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ اس کا مصنف زمرے میں ہے یا اس سے باہر ہے۔ یہ سوال اس وقت اٹھ سکتا ہے جب ایک مذہبی معاشرہ جس کی اساس ان دو سہل قضیوں پر استوار ہو اور کوئی ملحد ان دونوں قضیوں کو یا ان میں سے ایک کو مسترد کرتا ہو۔ اس طرح کا ملحدانہ عقیدہ تاریخ اسلام میں نادر ہونا چاہیے اور رہا ہے جو اپنی حدود کے قابل رشک تحفظ کے ساتھ ان حدود میں رہتے ہوئے تعبیر و تاویل کی آزادی عطا کرتا ہو اور چونکہ اس نوع کا ملحدانہ عقیدہ جو اسلام کی سرحدوں کو متاثر کرتا ہو تاریخ اسلام میں نادر رہا ہے اس لیے ایک عام مسلمان کے احساسات میں قدرتی طور سے شدت آجاتی ہے جب کبھی اس قبیل کی

کوئی بغاوت اُٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس درجہ شدید ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلمانوں کے مختلف ذیلی فرقوں میں چھوٹے چھوٹے قانونی اور دینیاتی نکتوں پر الحاد کے الزامات ایک عام سی بات ہے۔ دینیات کے چھوٹے سے نکتے پر اختلاف اور انتہائی ملحدانہ معاملات میں جس صورت میں ملحد کا دائرہ اسلام سے اخراج لازم ہو جائے لفظ کفر کے اس بے محابا استعمال سے آج کل کے کچھ پڑھے لکھے مسلمانوں کو جنھیں مسلمانوں کے دینیاتی تنازعوں کی تاریخ کی کچھ خبر نہیں، ان امور میں مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی انتشار کی علامت نظر آتی ہے۔ تاہم یہ بالکل غلط تصور ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ دینیات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اختلاف کے چھوٹے چھوٹے نکتوں پر الحاد کا الزام عائد کرنا تباہ کن قوت کا کام کرنے کی بجائے اصل اشہب دینیاتی فکر کے لیے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ پروفیسر ہرگرونج کہتے ہیں کہ ''جب ہم قانون محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عہد کے علما و فضلا ذرا سی بات پر ایک دوسرے کو ملحد ٹھہرا دیتے ہیں اور دوسری طرف وہی لوگ عظیم تر اتحاد مقصد کی خاطر اپنے پیش روؤں کے اسی نوع کے تنازعات کو حل کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔'' مسلم دینیات کا طالب علم اس بات سے باخبر ہے کہ مسلم ماہرین قانون اس نوع کے الحاد کو ''الحاد زیر الحاد'' کا نام دیتے ہیں اور اس نوع کے الحاد سے مجرم کا اخراج لازم نہیں آتا۔ تاہم اس امر کا اعتراف ہونا چاہیے کہ ملاؤں کے ہاتھوں میں جن کی عقلی سہل انگاری جملہ دینیاتی فکر کی مخالفت کو حقیقی مخالفت پر محمول کرتی ہے اور نتیجتاً انھیں اختلاف میں اتحاد نظر نہیں آتا یہ چھوٹی سی زندیقی ایک بڑی شرارت کا منبع بن جاتی ہے۔ اس شرارت کا علاج صرف اس طرح سے ممکن ہے کہ ہم اپنے دینی مدارس کے طلبا کو اسلام کی حقیقی روح کی واضح تر تصویر سے متعارف کرا دیں اور انھیں دینیاتی منطقی بحث و استدلال کے فن سے روشناس کرایا جائے تا کہ وہ کسی بھی تحریک کے اصول کی منطقی استرداد کی ضرورت سے واقف ہو جائیں۔ بڑے الحاد کا سوال اسی وقت اٹھے گا جب کسی مفکر یا مصلح کی تعلیمات اسلام اور ایمان کی سرحدوں کو متاثر کریں۔ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ یہ سوال قادیانیت کی تعلیم کے ضمن میں یقینی طور پر اُٹھتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ہو جانی

چاہیے کہ قادیانی تحریک دو گروہوں میں منقسم ہے: قادیانی اور لاہوری۔ اول الذکر علی الاعلان بانی تحریک کو ایک مکمل رسول کہتا ہے۔ مؤخر الذکر نے عقیدتاً یا حکمت عملی کے نقطہ نظر سے یہ مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو ذرا دھیمے سروں میں رکھا جائے۔ تاہم یہی سوال کہ کیا احمدیت کے بانی رسول تھے؟ دونوں گروہوں کے مابین وجہ نزاع ہے اور اسے ہی میں بڑا الحاد کہتا ہوں۔ میرے مقاصد کے لیے احمدیوں کی اس داخلی بحث کے حسن و قبح کے بارے کوئی رائے قائم کرنا غیر ضروری ہے۔ میں اس کا قائل ہوں جس کے وجوہ کی ابھی وضاحت کی جائے گی، کہ پورے رسول کا یہ تصور ہی ایسا ہے جو متعلقہ شخص کے اسلام سے اخراج کا باعث بنتا ہے۔ اور احمدیت کے لیے ازبس ضروری ہے اور یہ کہ قادیانیوں کے موجودہ سربراہ لاہوریوں کے امام کے مقابلے میں تحریک کی روح سے زیادہ استقامت کے ساتھ قائل اور ہم آہنگ ہیں۔

اسلام میں نظریہ خاتمیت کی ثقافتی قدر و قیمت کی میں نے کسی اور جگہ پوری تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ اس کا مطلب سادہ سا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور ذی روح کے سامنے روحانی اعتبار سے سر تسلیم خم نہ کیا ہو جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایک قانون عطا کر کے نجات دلا دی ہو جو اس لیے ممکن العمل ہو کہ وہ انسانی شعور سے برآمد ہوا۔ دینیات کے اعتبار سے معاشرتی و سیاسی تنظیم جسے ''اسلام'' کہا جاتا ہے مکمل اور دائمی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وحی و الہام ممکن نہیں جس سے انکار الحاد و زندیقی ہے۔ وہ جو اس نوع کی وحی کا دعویدار ہے وہ اسلام کا غدار ہے۔ چونکہ قادیانی یہ یقین رکھتے ہیں کہ بانی تحریک کو الہام ہوتا تھا اسی لیے وہ تمام عالم اسلام پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ بانی کا اپنا استدلال ازمنہ وسطیٰ کے ماہر دینیات کی شان کے شایان ہے کہ اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک اور رسول کی تخلیق نہیں کر سکتے تو ان کی روحانیت کو نامکمل تصور کرنا چاہیے۔ بانی تحریک دعویٰ کرتے ہیں کہ خود ان کی رسالت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت کی رسول تخلیق کرنے کی قوت کی شہادت ہے۔ لیکن اگر آپ ان سے مزید دریافت کریں کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ رسول تخلیق کرنے کی اہل ہے تو ان کا جواب ہوگا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی نہیں تھے آخری نبی میں ہوں۔ تاریخ بنی نوع انسان میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص اسلامی نظریہ خاتمیت کی ثقافتی قدر و قیمت کو سمجھنے کے بجائے وہ (بانی

تحریک) سمجھتے ہیں کہ خاتمیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر محمد ﷺ کا کوئی اور پیروکار منصب رسالت تک نہیں پہنچ سکتا تو یہ بات محمد ﷺ کی رسالت میں خامی پر دلالت کرتی ہے۔جب میں ان کے ذہن کا نفسیاتی مطالعہ کرتا ہوں کہ وہ خود تو پیغمبر اسلام ﷺ کی روحانیت کی تخلیقی صلاحیت سے استفادہ کرتے ہیں لیکن حضور رسالت مآب ﷺ کو ایک طرف تو خاتمیت سے محروم کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ رسول اکرم ﷺ کی صلاحیت تخلیق رسالت کو صرف ایک رسول کی حد تک محدود کر دیتے ہیں یعنی بانی تحریک احمدیت تک۔اس طرح سے نیا رسول ان سے خاموشی کے ساتھ خاتمیت سرقہ کرتا ہے جن کے بارے میں وہ دعویدار ہے کہ وہ اس کے روحانی پیشوا تھے۔

وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بروز ہیں اور بروز ہونے کے ناتے یہ اتہام لگاتے ہیں کہ ان کی (بانی تحریک احمدیت کی) خاتمیت حقیقتاً محمد ﷺ کی ہی خاتمیت ہے۔اس لیے ان کے اس معاملے میں نقطہ نظر سے حضرت رسول اکرم ﷺ مجروح نہیں ہوتی۔دو خاتمیتوں کی نشاندہی کر کے یعنی اپنی خاتمیت اور حضور رسالت مآب ﷺ کی خاتمیت وہ نہایت آسانی کے ساتھ نظریہ خاتمیت کے دنیوی مفہوم کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔تاہم یہ بھی بدیہی بات ہے کہ لفظ بروز (مکمل یکسانیت کے معنی میں) بھی ان کی دستگیری نہیں کرسکتا کیونکہ بروز تو اصل کی دوسری سمت ہوتا ہے۔صرف آواگون کے اعتبار سے بروز اصل کے یکساں بن سکتا ہے۔پس اگر ہم لفظ بروز کے یہ معنی سمجھ لیں کہ "روحانی صفات میں ایک جیسا"، تب بھی دلیل غیر موثر رہتی ہے۔اگر دوسری جانب ہم اس لفظ کے آریائی مفہوم کے مطابق آواگون (عقیدہ تناسخ) کے مطابق بروز بمطابق اصل کے لیں تو دلیل تو قابل قبول ہو جاتی ہے لیکن اس کا مصنف مجوسی کا بہروپ دھار لیتا ہے۔

عظیم مسلم صوفی محی الدین ابن العربی ہسپانوی کے تتبع میں مزید یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلم ولی اللہ اپنی روحانیت کے ارتقا کے دوران اس نوع کا تجربہ حاصل کرے جو رسالت کی صفات سے متصف ہوتا ہے۔میں ذاتی طور پر ابن العربی کے اس نظریے کو نفسیاتی اعتبار سے غلط سمجھتا ہوں لیکن اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ درست ہے تو بھی قادیانی دلیل مکمل طور سے اپنے موقف کو غلط طور سے سمجھنے پر مبنی ہو گی۔شیخ ابن العربی اسے خالصتاً نجی

کامیابی پر محمول کرتے ہیں اور جو صوفی کو اس امر کا مجاز نہیں ٹھہراتے کہ جو اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گا۔ دراصل شیخ کے نقطہ نظر سے ایک ہی عہد اور ایک ہی ملک میں شعور رسالت کے حامل ایک سے زیادہ اولیائے کرام زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ لائق توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ کسی ولی کے لیے نفسیاتی طور سے تجربہ رسالت کا حصول ممکن ہے لیکن اس کی وہ معاشرتی، سیاسی اہمیت نہیں جو انھیں ایک نئی تنظیم کا مرکز قرار دے اور انھیں یہ استحقاق عطا کر دے کہ وہ یہ اعلان کرسکیں کہ یہ تنظیم ہی محمد ﷺ کے پیروؤں کے لیے معیار ایمان و کفر ہے۔

اس کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر مجھے فتوحات کی متعلقہ عبارت کے محتاط مطالعے سے یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس عظیم ہسپانوی صوفی کو محمد ﷺ کی ختم نبوت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ اور اگر انھوں نے اپنے صوفیانہ کشف میں یہ دیکھ لیا ہوتا کہ مشرق میں کوئی ہندی تصوف میں عطائی، ان کی صوفیانہ نفسیات کے زیر اثر رسول مقبول ﷺ کی ختم نبوت کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ یقیناً علمائے ہند کے ذریعہ سے مسلمانان عالم کو اسلام کے ان غداروں کے خلاف پیشگی انتباہ کر دیتے۔

احمدیت کے لب لباب کی جانب آتے ہوئے اس کے ذرائع اور ان طریقوں پر گفتگو جن کے توسل سے ما قبل اسلام مجوسی تصورات اسلامی تصوف کی راہوں سے در آئے اور انھوں نے اس کے مصنف کے ذہن پر کیا کیا اثرات مرتب کیے مطالعہ تقابل ادیان کے نقطہ نظر سے بے حد دلچسپ ہو گا۔ تاہم میرے لیے اس بحث کو یہاں چھیڑنا ناممکن ہو گا۔ اتنا کہنا کافی ہو گا کہ احمدیت کی اصل روح ازمنہ وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کی دھند کے پیچھے مستور ہے۔ لہٰذا ان خالصتاً دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی اسلحہ لے کر اس سے نبٹنے کے لیے نکل آئے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس تحریک سے نبرد آزما ہونے کے لیے یہ درست طریقہ نہیں تھا۔ چنانچہ علما کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ محض جزوی تھی۔ بانی کے الہامات کا ایک محتاط نفسیاتی تجزیہ شاید ان کی ذات کی داخلی زندگی کی تشریح کا ایک موثر ذریعہ ہو۔ اس ضمن میں مولوی منظور الٰہی کی اس تالیف کا میں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انھوں نے بانی کے الہامات جمع کیے ہیں۔ یہ تالیف نفسیاتی تحقیق کے لیے قابل قدر اور متنوع قسم کا مواد مہیا کرتا ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانی تحریک

کے کردار اور شخصیت کے بارے میں ایک کلید فراہم کرتی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جدید نفسیات کا کوئی جواں سال طالب علم کسی دن اس کتاب کو سنجیدہ مطالعہ کے لیے منتخب کرے گا۔ اگر وہ قرآن کریم کو اپنا معیار بنائے جوان وجوہات کی بنا پر اشد ضروری ہوگا جن کی یہاں وضاحت نہیں کی جاسکتی اور اپنے مطالعہ کو بانی تحریک احمدیہ کے تجربات کا ہم عصر غیر مسلم صوفیوں مثلاً بنگال کے رام کرشن کے تجربات سے تقابل تک لے جائے گا تو مجھے یقین ہے کہ اسے اس تجربے کے ناگزیر کردار پر ایک سے زیادہ مرتبہ تعجب کا سامنا کرنا ہوگا جس کی بنا پر احمدیت کے بانی نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے ایک اور یکساں طور پر موثر اور زیادہ ثمر آور طریقہ کار یہ ہوگا کہ احمدیت کے حقیقی مشمولات کو ہند میں تاریخ اسلامی دینیات کی فکر کی روشنی میں سمجھا جائے کم سے کم ۱۷۹۹ء سے۔ یہ سال عالم اسلام کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس شکست کا مطلب تھا کہ ہند میں مسلمانوں کے سیاسی وقار کی امیدوں کا دیا بجھ گیا۔ اسی سال جنگ نوارنیولڑی گئی جس نے ترکیہ کے بحری بیڑے کو تباہی کے گھاٹ اترتے دیکھا۔ اگر کوئی سرنگا پٹم جائے تو وہ ٹیپو کے مزار کی دیوار پر یہ الفاظ نقش دیکھے گا ''عظمت ہند و روم رفت شد'' اس نوشتہ کے مصنف کے ان الفاظ کی پیش گوئی میں کس قدر صداقت ہے۔ پس اس طرح ۱۷۹۹ء میں ایشیا میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن جس طرح یوم جینا کے موقع پر جرمنی کی تذلیل سے جدید جرمن قوم نے جنم لیا بعینہٖ اسلام کی سال ۱۷۹۹ء میں سیاسی تذلیل کے بطن سے جدید اسلام اور اس کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس بات میں بھی اتنی ہی صداقت ہے۔ اس نکتہ کی میں اس کے مقام پر وضاحت کرونگا۔ فی الوقت تو میں قارئین کی توجہ ان چند سوالات کی طرف منعطف کراؤں گا جو مسلم ہند میں ٹیپو کے زوال اور ایشیا میں یورپی سامراجیت کے ارتقا کے زمانہ سے ابھرے۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کی نشاندہی کرتا ہے؟ کس طرح سے ہندی مسلمانوں بلکہ ترکی سلطنت سے باہر جملہ مسلمانوں کی خلافت عثمانیہ سے وابستگی قائم تھی؟ کیا ہند دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریہ جہاد کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ قرآن کریم کی اس آیت

کریمہ میں کہ ''اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں'' تم میں سے اولی الامر، سے کیا مراد ہے؟ احادیث رسالت مآب ﷺ میں امام مہدی کے ظہور کی پیش گوئی کی کیا نوعیت ہے؟ یہ سوالات اور چند اور جو بعد ازاں پیدا ہوئے بدیہی وجوہ کی بنا پر صرف ہندی مسلمانوں کے لیے تھے۔ یورپی سامراج کو بھی جو نہایت سرعت کے ساتھ عالم میں داخل ہو رہا تھا ان سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات نے جو مباحث اٹھائے وہ ہند میں تاریخ اسلام کا بہت دلچسپ باب ہے۔ یہ داستان خاصی طویل ہے اور ابھی بھی ایک زوردار قلم کی منتظر ہے۔ مسلم سیاستدان جن کی نگاہیں صورت حال کے حقائق پر لگی ہوئی تھیں علما کے ایک ایسے طبقے کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جنھوں نے دینیاتی استدلال کا ایسا ڈھب اختیار کر لیا جو ان کے خیال میں صورت حال کے موافق تھا لیکن صرف منطق کے بل پر ایسے عقائد پر فتح پانا سہل نہیں ہوتا جو صدیوں سے ہند میں مسلمان عوام کے دلوں پر راج کر رہے ہوں۔ ایسی صورت حال میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بنا پر کام کرتی ہے یا متن اور روایات کی تازہ تعبیر و تاویل کی بنا پر۔ بہر صورت دونوں صورتوں میں استدلال عوام کے لیے قابل قبول نہ ہو گا۔ کٹر مذہبی پیروان اسلام کے لیے ایک ہی بات قابل قبول ہو سکتی ہے اور وہ ہے تحکم الٰہی۔ پرانے عقائد کو مؤثر طریقے سے زائل کرنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ مذکورہ بالا سوالات میں مضمر دینیاتی نظریات کی سیاسی اعتبار سے مناسب تعبیر و تاویل کو الہامی بنیاد فراہم کر دی جائے۔ یہ الہامی بنیاد احمدیت نے مہیا کی اور احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ برطانوی سامراج کی عظیم ترین خدمت ہے جو انھوں نے سرانجام دی۔ سیاسی اہمیت کے دینیاتی نظریات کو پیغمبرانہ الہامی بنیاد فراہم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مدعی کے خیالات کو تسلیم نہیں کرتے وہ اول درجے کے کافر ہیں اور جہنم کا ایندھن بننا ان کا مقدر ہے۔ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں تحریک کی اہمیت کے لحاظ سے احمدیوں کا یہ عقیدہ کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک فانی انسان کی موت سے ہمکنار ہوئے اور ان کے دوبارہ ظہور کا مطلب محض ایک ایسے شخص کا ظاہر ہونا ہے جو روحانی طور پر ''بالکل ان جیسا ہو'' تحریک کو ایک طرح کی عقلی صورت عطا کرتا ہے۔ لیکن یہ روح تحریک کے لیے دراصل لازمی نہیں۔ میرے خیال میں یہ مکمل نبوت کے تصور کے لیے صرف ابتدائی اقدامات تھے جنھیں آخر کار نئی سیاسی قوتوں کے مقاصد کو

پورا کرنے کے لیے جنم دیا گیا۔

قدیم ممالک میں منطق کی بجائے حکم چلتا تھا۔کافی مقدار میں جہالت اور جوش اعتقادی حیرت انگیز طور پر کافی ذہانت کے ساتھ یکجا ہوسکتی ہیں اور ایک شخص جو جرات رندانہ کا مالک ہو یہ اعلان کرسکتا ہے کہ اسے خدائے تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا ہے جس کا انکار کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون ومقہور قرار دیا جاسکتا ہے۔ایک غلام مسلم ملک میں ایک آسان بات ہے کہ ایسی سیاسی دینیات ایجاد کرلی جائے اور ایسا فرقہ تشکیل دے دیا جائے سیاسی غلامی جس کا مسلک ہو اور پنجاب میں تو مبہم دینیاتی اظہار کا ایک بھدا سا بنا ہوا جال نہایت آسانی سے معصوم کسانوں کو پھانس سکتا ہے جو صدیوں سے ہر قسم کے استحصال کا شکار بننے پر آمادہ ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو جملہ مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگوں کو متحد ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ طنزیہ مشورہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہند میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں اعلیٰ ترین اہمیت کے مذہبی اور سیاسی ایشو دونوں مضمر ہیں۔جیسا کہ میں نے مذکورہ بالا سطور میں وضاحت کی احمدیت کا مقصد اسلامی مذہبی فکر کی تاریخ میں ہند کی موجودہ سیاسی غلامی کے لیے الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔خالصتاً مذہبی ایشو سے قطع نظر محض سیاسی ایشو کی بنیاد پر، میں سمجھتا ہوں، پنڈت جواہر لال نہرو جیسے انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہندی مسلمانوں پر رجعت پسندانہ قدامت پرستی کا الزام عائد کریں۔مجھے اس باب میں مطلق شبہ نہیں کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو وہ ایک مذہبی تحریک کے بارے میں ہندی مسلمانوں کے رویے کو بے حد سراہتے جو (احمدیت) ہند کے دکھوں کو منجانب اللہ ہونا قرار دیتے ہیں۔

پس قاری یہ مشاہدہ کرے گا کہ احمدیت کی جو پیلاہٹ ہم ہندی اسلام کے رخساروں پر دیکھتے ہیں وہ ہند میں مسلمانوں کے مذہبی فکر کی تاریخ میں اچانک عنصر کے طور پر نمودار نہیں ہوگی۔

وہ تصورات، جنھوں نے آخر کار اس تحریک کی شکل اختیار کی بانی احمدیت کی پیدائش سے بہت پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں ہو گئے تھے۔نہ ہی میری غرض یہ الزام لگانا ہے کہ بانی تحریک احمدیت اور ان کے ساتھیوں نے عمداً اپنا منصوبہ ترتیب دیا۔میں یہ کہنے کی جسارت کرتا

ہوں کہ بانیٔ احمدیت نے یقیناً کوئی آواز سنی ہوگی لیکن یہ آواز اس حی و قیوم کی جانب سے آئی یا لوگوں کی روحانی بضاعتی کی طرف سے بلند ہوئی اس کا تمام پر انحصار اس تحریک کی نوعیت پر ہونا چاہیے جسے اس نے جنم دیا اور اس فکر اور جذبے کی نوع پر جو اس نے ان لوگوں کو عطا کیا جنھوں نے اس آواز پر کان دھرے۔ قاری کو یہ قیاس نہ کرنا چاہیے کہ میں استعاری زبان استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی زندہ تاریخ حیات اس امر کا اظہار کرتی ہے کہ جب کسی قوم میں زندگی کی لہر انگڑائی لینا شروع کرتی ہے تو انحطاط فی نفسہ ترغیب کا منبع بن جاتا ہے جو اس کے شعراء فلسفیوں، صوفیا مدبرین کو ترغیب دیتا ہے اور انھیں اوتاروں کے ایک قبیلے کی ہیئت عطا کر دیتا ہے جن کا واحد وظیفہ حیات یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی زندگی میں ہر مذموم اور بھدی شے کو گمراہ کن منطقی فن کے ذریعے سے عظمت بخش دے۔ وہ اوتار غیر شعوری طور پر مایوسی کو امید کے خیرہ کن لباس میں ملبوس کر دیتے ہیں، کردار کی روایتی اقدار کو ضرر پہنچاتے اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو تباہ کر دیتے ہیں جو ان کے چنگل میں پھنس جائیں۔ کوئی بھی شخص ان لوگوں کی قوت ارادی کی زبوں حالی کا صرف تصور ہی کر سکتا ہے جو احکام الٰہیہ کے تحت اپنے سیاسی ماحول کو حتمی طور پر قبول کرنے پر مجبور کر دیے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمدیت کے ڈرامے میں جس قدر کردار تھے وہ سب انحطاط کے ہاتھوں میں معصوم حربے تھے۔ بعینہٖ اسی نوع کا ایک ڈرامہ پہلے ہی فارس (اب ایران) میں کھیلا جا چکا ہے لیکن وہ ان مذہبی اور سیاسی عواقب تک نہ لے جا سکا اور نہ لے جا سکتا تھا جنھیں احمدیت نے ہند میں اسلام کے لیے تخلیق کیا۔ روس نے بابیت کے ساتھ رواداری اور تحمل کا برتاؤ کیا اور بابیوں کو اشک آباد میں اپنا پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کو ووکنگ میں پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت عطا کر کے ان کے ساتھ اسی رواداری کو برتا۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار امر ہے کہ روس اور انگلستان نے اس تحمل کا مظاہرہ سامراجی مصلحت کی بنا پر کیا یا خالصتاً وسیع النظری کی بنیاد پر۔ البتہ اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے ایشیا میں نہایت دشوار مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام کے ڈھانچے کے پیش نظر، جیسا کہ میں اسے سمجھتا ہوں، میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئیں

زیادہ خالص شکل میں برآمد ہوگا۔ وقت بدل رہا ہے۔ ہند میں حالات ایک نئے موڑ پر مڑ گئے ہیں ۔جمہوریت کی نئی روح جو ہند میں جلوہ گر ہو رہی ہے یقیناً احمدیوں کو یہ باور کرا دے گی کہ ان کی دینیاتی اختراعات بے کار محض ہیں۔

نہ ہی اسلام قرون وسطیٰ کے تصوف کے احیا کو برداشت کرے گا جس نے اپنے پیروؤں سے ان کی صحت مند جبلتوں کو تو پہلے ہی لوٹ لیا ہے اور اس کے عوض انھیں صرف غیر واضح اور مبہم سوچ دی ہے۔ اس نے گذشتہ صدیوں کے دوران اسلام کے بہترین اذہان کو تو جذب کر لیا اور امور مملکت محض معمولی استعداد کے لوگوں کی تحویل میں دے دیے۔ جدید اسلام اس تجربے کو دہرانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی یہ پنجاب کے تجربے کو دہرانا برداشت کر سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مباحث میں الجھائے رکھے جن کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اسلام پہلے ہی تازہ فکر اور تجربے کے منور دن میں نکل آیا ہے اور اب اسے کوئی صوفی یا نبی قرون وسطیٰ کے تصوف کی دھند میں واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں اپنی توجہ پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کی جانب مبذول کرتا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ پنڈت کے مضامین سے یہ امر آشکار ہوتا ہے کہ انھیں نہ اسلام کا کوئی علم ہے اور نہ ہی انیسویں (۱۹) صدی میں اس کی مذہبی تاریخ سے کوئی واقفیت اور نہ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے وہ کچھ پڑھا ہے جو میں ان کے سوالات کے موضوع پر پہلے لکھ چکا ہوں۔

میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں وہ سب کچھ یہاں دوبارہ سپرد قلم وقرطاس کر دوں جو میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ یہاں ۱۹/ویں صدی میں اسلام کی مذہبی تاریخ دہرا دی جائے جس کے بغیر عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کا کوئی حصہ سمجھنا ناممکن ہے۔ ترکی اور جدید اسلام پر سیکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ میں نے یہ بہت سا ادب پڑھا ہے اور شاید پنڈت نے بھی اسے پڑھا ہو تاہم میں انھیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مصنف اس معلول کو اس علت کا سبب سمجھتا ہو جس نے اسے پیدا کیا ہو۔ یہ از بس ضروری ہے کہ ۱۹/ویں صدی کے دوران ایشیا میں مسلم فکر کے بڑے مدوجزر کی جانب مختصراً اشارہ کر دیا جائے۔

میں اوپر یہ کہہ چکا ہوں کہ ۱۷۹۹ء کے برس میں اسلام کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ تاہم اسلام کی داخلی قوت کی اس سے عظیم تر سند اور کیا ہو سکتی ہے کہ عملاً اس نے دنیا میں اپنے مقام کے حصول میں کوئی وقت نہیں لیا۔ ۱۹/ویں صدی کے دوران ہند میں سرسید احمد خان پیدا ہوئے، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں۔ ان صاحبوں نے غالباً محمد ابن عبدالوہاب سے اثر قبول کیا جو ۱۷۰۰ء میں نجد میں پیدا ہوئے۔ بانی نام نہاد وہابی تحریک جسے درست طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن کہا جا سکتا ہے۔ سرسید احمد خان کا اثر من حیث المجموع ہند تک ہی محدود رہا۔ تاہم یہ اغلب ہے کہ وہ پہلے جدید مسلمان ہوں جنھوں نے آنے والے عہد کے اثباتی کردار کی جھلک دیکھ لی ہو۔ اسلام کے دکھوں کا مداوا جو انھوں نے تجویز کیا، جیسا کہ مفتی عالم جان نے روس میں تجویز کیا وہ جدید تعلیم کا حصول تھا۔ لیکن ان کی حقیقی عظمت اس حقیقت میں مضمر تھی کہ وہ پہلے ہندی مسلمان تھے جنھوں نے اسلام کی تازہ تعبیر کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے کام کیا۔ ہم ان کے مذہبی تصورات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے جدید عہد پر ردعمل کا اظہار کیا۔ ہندی مسلمانوں کی انتہائی قدامت پسندی جس کی زندگی کے حقائق پر سے گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی تھی سید احمد خان کے مذہبی رویے کے اصلی معنی و مفہوم کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ہند کے شمال مغربی علاقے جو باقی ماندہ ملک کے مقابلے میں زیادہ قدیم اور زیادہ پیر پرست تھے سید کی تحریک کے جلد ہی بعد احمدیت کا ردعمل ظاہر ہوا۔ سامی اور آریائی تصوف کا ایک حیرت انگیز آمیزہ جس میں پرانے اسلامی تصوف کے اصولوں کے مطابق روحانی احیا فرد کی داخلی پاکیزگی کی بجائے عوام کے متوقع رویے کی تشفی کے لیے "مسیح موعود" کا تصور فراہم کر دیا گیا۔ "مسیح موعود" کا کار منصبی فرد کو حال کی ناتوانی سے نجات دلانا نہیں تھا بلکہ اس کی انا کو غلامانہ انداز میں اس کے احکام کے تابع کرنا تھا۔ اس ردعمل میں ایک نہایت لطیف تضاد موجود تھا۔ یہ اسلام کے نظم کو تو برقرار رکھتا تھا لیکن اس عزم کو تباہ کرتا تھا جس کی مضبوطی کا وہ نظم داعی تھا۔

مولانا سید جمال الدین افغانی مختلف چہرے مہرے کے آدمی تھے۔ قدرت کا نظام بھی عجیب و غریب ہے مذہبی فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے ہمارے زمانے کا ایک بے حد ترقی

یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوا۔ دنیا کے تقریباً تمام مسلم ممالک کی زبانوں کا ماہر جنھیں قدرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ دلوں کو موہ لینے والے فن خطابت سے نوازا تھا۔ ان کی بے قرار روح انھیں ایک مسلم ملک سے دوسرے میں لیے پھرتی رہی۔ انھوں نے فارس (اب ایران) مصر اور ترکیہ کی بے حد ممتاز شخصیتوں کو متاثر کیا۔ ہمارے عہد کے عظیم ترین ماہرین دینیات جیسے مفتی محمد عبدہ اور نئی نسل کے افراد جنھوں نے بعد ازاں سیاسی قیادت سنبھالی مثلاً مصر کے زاغلول پاشا ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ انھوں نے کبھی نبی یا مصلح ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تاہم ان سے زیادہ اور کسی نے ہمارے زمانے میں روح اسلام کو اتنا گہرا نہیں جھنجھوڑا۔ ان کا جذبہ اب بھی عالم اسلام میں روبہ عمل ہے اور کون جانے کہ وہ کب اور کہاں ختم ہوگا۔

تاہم یہ دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ان عظیم مسلمانوں کا ٹھیک ٹھیک مقصد کیا تھا؟ جواب ہے کہ انھوں نے یہ جان لیا تھا کہ تین بڑی قوتیں عالم اسلام پر حکمران ہیں۔ انھوں نے اپنی توانائی ان قوتوں کے خلاف بغاوت برپا کرانے پر مرکوز کردی۔

۱- ملائیت: علما ہمیشہ اسلام کے لیے زبردست تقویت کا باعث رہے لیکن صدیوں کے دوران بالخصوص بغداد کی تباہی کے بعد انھوں نے قدامت پرستی کی عبا زیب تن کر لی اور اجتہاد کی آزادی کی رہ مسدود کر دی یعنی امور قانون میں آزاد فیصلے کا اختیار سلب کر لیا۔ وہابی تحریک دراصل ۱۹ر ویں صدی کے مسلمان مصلحین کا اولین مقصد دین کے تازہ رخ کا تعین کرنا اور ترقی پذیر تجربے کی روشنی میں شریعت (قانون) کی دوبارہ تعبیر و تاویل کی آزادی کا حصول تھا۔

۲-تصوف: مسلمان عوام اس نوع کے تصوف کے چکر میں گرفتار ہو گئے جس نے حقائق کو تو ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور انھیں جملہ اقسام کے توہمات کا اسیر بنا دیا۔ تصوف اپنی روحانی تعلیم کی ایک قوت کے اعلیٰ و ارفع مقام سے نیچے گرا اور محض لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کے استحصال کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اس نے بتدریج اور نظر نہ آنے والے طریقہ سے اسلام کو اس کی قوت ارادی سے محروم کرنا شروع کر دیا اور اسے اس حد تک نرم کر دیا کہ (لوگ) شریعت اسلام کی سخت نظم کی پابندیوں سے خلاصی طلب کرنے لگے۔ ۱۹ر ویں صدی کے مصلحین نے اس تصوف

کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور مسلمانوں کو اس کی تاریکی سے جدید دنیا کی روشنی میں نکل آنے کی دعوت دی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ مادہ پرست تھے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح کی جانب متوجہ کر دیں جس کا مقصد مادہ کی تسخیر تھا، اس سے (پسپا ہو کر) بھاگنا نہیں تھا۔

۳۔مسلمان بادشاہوں نے جن کی نظریں محض اپنے موروثی مفادات پر لگی ہوئی تھیں اور جب تک یہ محفوظ تھے، اپنے ملکوں کو زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھوں فروخت کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہ کیا۔ عالم اسلام میں اس صورت حال کے خلاف مسلم عوام کو بغاوت کے لیے اکسانا سید جمال الدین افغانی کا خصوصی مشن تھا۔

یہاں یہ تو ممکن نہیں کہ ان مصلحین نے مسلم فکر اور احساس کی دنیا میں کیا کیا تبدیلیاں برپا کیں ان کا تفصیلی احوال بیان کر دیا جائے۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ انھوں نے کچھ اور لوگوں مثلاً زاغلول پاشا، مصطفی کمال (اتاترک) اور رضا شاہ کے لیے بہت بڑی حد تک زمین ہموار کر دی۔ مصلحین نے تعبیر کی، استدلال کیا اور تشریح کی لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے وہ اگرچہ تعلیمی استعداد کے لحاظ سے تو ان سے کم تر درجے کے تھے لیکن انھوں نے اپنی صحت مند جبلتوں پر بھروسا کیا۔ ان میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ زندگی کے نئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کتاب تاباں کی روشنی میں جو کچھ ضروری ہے کہہ گزریں خواہ اس کے لیے انھیں قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ ایسے لوگوں سے غلطیوں کا سرزد ہونا عین ممکن ہے لیکن تاریخ اقوام و ملل یہ بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کی غلطیاں بھی بعض اوقات ثمر آور ثابت ہو جاتی ہیں۔ وہ منطق کا سہارا نہیں لیتے بلکہ زندگی کی انتھک جدو جہد پر اعتبار کرتے ہیں جو اپنے مسائل خود حل کرتی ہے۔ یہاں اس امر کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ سید احمد خان اور سید جمال الدین افغانی کے مسلم ممالک میں سیکڑوں پیرو کار مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مکتب قدیم کے ملاؤں کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا اور اس دانش اور روحانی ماحول کو جذب کیا تھا جس کی بعد ازاں انھوں نے تشکیل نو کا عزم کیا تھا۔ جدید تصورات کا دباؤ تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ جس کی جانب او پر اور مختصراً اشارہ کیا گیا واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ وہ انقلاب جو ترکی میں رونما ہوا اور جو جلد یا بدیر دیگر مسلم ممالک میں آ کر رہے گا، اس کا تعین کم و بیش مکمل طور پر داخلی قوتوں نے کیا تھا۔ یہ

جدید عالم اسلام کا سطحی مبصر نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ عالم اسلام کا موجودہ بحران بیرونی قوتوں کی کارکردگی کا نتیجہ ہے۔

پھر کیا بیرون ہند عالم اسلام نے یا بالخصوص ترکی نے اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو یہ گمان کرتے ہیں کہ ترکی ایک مسلمان ملک نہیں رہا۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ آیا ایک شخص یا گروہ مسلمان نہیں رہا، مسلم نقطہ نظر کے اعتبار سے خالصتاً ایک قانونی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلامی ڈھانچے کے اصولوں کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔ جب تک کہ کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں کا قائل ہے یعنی اللہ کی توحید اور رسول اکرم ﷺ کی ختم نبوت، کٹر سے کٹر مُلّا بھی اسے زمرہ اسلام سے خارج نہیں کرسکتا خواہ اس کی تعبیر شریعت (قانون) یا متن قرآن کریم کی تاویل کو بھی غلطی پر مبنی خیال کیا جاتا ہو۔ لیکن شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ فرض کی گئی یا حقیقی اختراعات ہیں جو اتاترک نے رائج کیں۔ آئیے ہم لمحہ بھر کے لیے ان کا جائزہ لیں۔ کیا ترکی میں عام مادیت پرستانہ نظریے کا پروان چڑھنا اسلام دشمن نظر آتا ہے؟ اسلام میں تیاگ دینے اور خیر باد کہنے کا عمل کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان حقائق کا سامنا کریں۔ مادیت پرستی مذہب کے مقابلے میں بڑا ہتھیار ہے لیکن یہ ملائیت اور صوفیانہ کاروبار کے لیے خاصا موثر ہے جو لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی کا استحصال کرنے کے لیے انھیں پر اسراریت کا چکر دیتا ہے۔ روح اسلام مادے کے ساتھ رابطے سے خوفزدہ نہیں۔ درحقیقت قرآن کہتا ہے ''دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرو''۔ ایک غیر مسلم کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہوگا۔ گذشتہ چند صدیوں کے دوران عالم اسلام کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ مادیت پسندانہ نظریے میں ترقی دراصل خود شناسی کی ایک شکل کے سوا کچھ نہیں۔ پھر کیا یہ پرانے لباس کو ترک اور لاطینی رسم الخط کو رائج کرنا ہے؟ ایک دین کی حیثیت سے اسلام کا کوئی ملک نہیں۔ ایک معاشرے کے طور پر اس کی کوئی خاص زبان نہیں۔ کوئی مخصوص لباس نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ترکی میں قرآن کریم کو پڑھنا بھی بلانظیر نہیں۔ ذاتی طور پر میں اس فیصلے کو ایک سنگین غلطی گردانتا ہوں کیونکہ عربی زبان اور ادب کا ایک طالب علم اس امر سے بخوبی باخبر ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے تو وہ عربی ہے۔ لیکن اطلاعات یہ ہیں کہ

ترک پہلے ہی مقامی زبان میں قرآن کریم کی تلاوت کو ترک کر چکے ہیں۔ پھر کیا یہ کثرت ازدواج کا خاتمہ یا علما کے لیے لائسنس حاصل کرنا ہے؟ اسلامی شریعت کے مطابق ایک مسلم مملکت کے امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس قانونی ''اجازت'' کو منسوخ کر دے اگر اسے یقین ہو جائے کہ یہ سماجی برائی کو جنم دیتی ہے۔ جہاں تک علما کے لیے لائسنس حاصل کرنے کا تعلق ہے اگر مجھے ایسا کرنے کا اختیار ہو تو میں یقینا اسے مسلم ہند میں رائج کر دوں۔ ملا کا دیو مالائی کہانیوں کا گھڑنا زیادہ تر ایک عام مسلمان کی حماقت کی وجہ سے ہے۔ اسے لوگوں کی دینی زندگی سے خارج کر کے اتاترک نے ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگوں کا دل خوش کر دیتا۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے جو ''مشکوۃ'' میں نقل ہوئی ہے کہ کسی اسلامی ملک کے امیر یا اس کے نامزد کردہ افراد کو ہی عوام میں تبلیغ کرنے کا استحقاق ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اتاترک اس حدیث مبارکہ سے باخبر تھے یا نہیں تاہم یہ ایک نمایاں بات ہے کہ کس طرح ان کے اسلامی شعور نے اس اہم معاملے میں ان کے اقدام کے حیطہ کار کو منور کر دیا۔ سوئٹزر لینڈ کی تعزیرات کو اس کے ضابطہ وراثت سمیت اختیار کرنا یقینا ایک سنگین غلطی ہے جو اصلاح کے جو انسال جذبے کے طور لائق معافی ہے بالخصوص ایسی قوم میں جو آگے بڑھنے کے بے پناہ جذبے سے سرشار ہو۔ ملا کی پہنائی کو برسہا برس پرانی بیڑیوں سے نجات کی مسرت بھی بعض اوقات عمل کی غیر آزمودہ راہوں پر گامزن کر دیتی ہے۔ لیکن ترکی اور باقی ماندہ عالم اسلام کو ابھی اسلامی قانونی وراثت کے غیر آشکارا معیشی پہلوؤں کو محسوس کرنا باقی تھا جنھیں قرآن کریم قانون اسلام کی نہایت ارفع اچھوتی شاخ کا نام دیتا ہے۔ کیا یہ خلافت کا خاتمہ یا کلیسا کی ریاست سے علیحدگی ہے؟ اپنے جوہر کے اعتبار سے اسلام سامراجیت نہیں ہے۔ خلافت کے خاتمہ سے جو بنو امیہ کے عہد سے ایک سلطنت کے روپ میں ڈھل گئی تھی یہ محض روح اسلام ہے جو اتاترک کے توسل سے روبہ عمل آ گئی۔ خلافت کے معاملے میں ترکی اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس ابن خلدون ...... عظیم فلسفی مؤرخ اسلام اور جدید تاریخ نویسی کے باوا آدم سے رہنمائی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کرسکتا کہ اپنے خطبات سے ایک اقتباس پیش کر دوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور مقدمے میں اسلام میں تصور عالمی خلافت کے تین نمایاں نظریے بیان کرتے ہیں (۱) کہ عالمی امامت ایک الٰہی ادارہ ہے اور نتیجتاً ناگزیر ہے (۲) کہ یہ محض ایک امر مصلحت ہے (۳) کہ اس نوع کے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آخری نظریہ خوارج کا تھا (اسلام کے شروع کے جمہوریت پسند)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید ترکی پہلے نظریے سے دوسرے پر چلے گئے یعنی معتزلہ کے نقطہ نظر پر جو عالمی امامت کو محض ایک امر مصلحت قرار دیتے ہیں۔ ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیاسی سوچ میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے جو صریحی طور پر یہ بتاتا ہے کہ عملاً عالمی امامت ناکام ہوگئی ہے۔ یہ قابل عمل تصور تھا جب سلطنت اسلام قائم و دائم تھی۔ اس سلطنت کی شکست وریخت کے بعد آزاد سیاسی وحدتیں منصہ شہود پر ابھریں۔ یہ تصور قابل عمل نہیں رہا اور جدید اسلام کی تنظیم میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت سے کام نہیں کرسکتا۔

نہ ہی کلیسا اور ریاست کے مابین علیحدگی کے تصور میں اسلام کے لیے کوئی اجنبیت ہے۔ شیعہ فارس (ایران) میں بڑے پیمانے پر امام کے نظریہ اخفا نے ایک اعتبار سے عرصہ دراز قبل اس علیحدگی کو عملی شکل دے دی تھی۔ مذہبی اور سیاسی مناصب میں علیحدگی سے اسلامی تصور کا یورپ کے کلیسا اور ریاست میں علیحدگی کے تصور سے خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ اول الذکر محض ایک تقسیم کار ہے جیسا کہ شیخ الاسلام اور وزرا کے عہدوں کے بتدریج قیام سے ظاہر ہے جب کہ مؤخر الذکر روح اور مادے کی مابعد الطبیعیاتی دوئی پر مبنی ہے۔ عیسائیت کا آغاز راہبوں کے سلسلے سے ہوا جس کا دنیوی امور سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام شروع ہی سے شہری مدنی معاشرہ تھا، اس کے قوانین بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے مدنی (غیر فوجی) تھے اگرچہ عقیدے کے نقطہ نظر سے ان کی ابتدا وحی یا الہام سے ہوئی۔ مابعد الطبیعیاتی دوئی نے جس پر یورپی تصور مبنی ہے یورپی اقوام میں بہت تلخیاں گھولیں۔ برسوں پہلے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا ''اگر حضرت عیسیٰ شکاگو تشریف لاتے'' اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے:

> ''مسٹر اسٹیڈ کی کتاب سے یہ سبق حاصل کیا جاسکتا ہے کہ وہ برائیاں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے وہ برائیاں ہیں جن کا مداوا صرف مذہبی محسوسات کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس مداوے کا عظیم

تر حصہ ریاست کی تحویل میں دے دیا گیا، یہ کہ خود ریاست کو بدعنوان سیاسی عناصر کے حوالے کر دیا گیا، یہ کہ عناصر نہ صرف ان برائیوں کا تدارک کرنے کے لیے غیر آمادہ ہیں بلکہ وہ اس کا تدارک کرنے سے قاصر ہیں اور یہ کہ بیداری ہی ان گنت لکھوکھا انسانوں کو اس مصیبت سے بچا سکتی ہے اور ریاست کو ذلت سے۔"

مسلمانوں کی سیاسی تجربے کی تاریخ میں اس علیحدگی کا مطلب علیحدگی فرائض ہے علیحدگی تصورات نہیں۔ یہ قرار نہیں دیا جاسکتا کہ مسلمان ممالک میں کلیسا اور ریاست کے مابین علیحدگی نے مسلمانوں کو قانون سازی کے عمل کو عوام کے اس شعور سے آزاد کر دیا جسے صدیوں کے دوران اسلام کی روحانیت نے تربیت دی اور پروان چڑھایا۔ صرف تجربہ ہی یہ بتائے گا کہ یہ تصور جدید ترکی میں کس طرح کام کرتا ہے۔ ہم محض یہ امید ہی کر سکتے ہیں کہ یہ ان برائیوں کو پیدا نہیں کرے گا جنھیں اس نے یورپ اور امریکہ میں جنم دیا۔

میں نے مذکورہ اختراعات پر مختصر بحث اپنے مسلمان قاری کی خاطر کی ہے پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے نہیں۔ جس اختراع کا پنڈت نے خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا وہ ترکوں اور فارسیوں (ایرانیوں) کی جانب سے نسلی اور قومی نظریات کا اختیار کرنا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی اور فارس (ایران) کا ایسے نظریات کے قبول کرنے کا مطلب ہے اسلام کو خیر باد کہہ دینا۔ تاریخ کا طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ اسلام ایسے وقت میں منصہ شہود پر ابھرا جب انسانی اتحاد جیسے خونی رشتے اور شاہی ثقافت کے پرانے اصول ناکامی کی دہلیز پر تھے۔ لہٰذا یہ انسانی اتحاد کا اصول خون اور ہڈیوں میں نہیں بلکہ انسانی ذہن میں پاتا ہے۔ درحقیقت اس کا بنی نوع انسان کے لیے معاشرتی پیغام یہ ہے: "نسل پرستی کے بت کو توڑ دو خونریز جنگ کا شکار ہو جاؤ"۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلام قدرت کی تعمیر نسل کے منصوبے کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نظریہ پیدا کرتا ہے جو قدرت کے تعمیر نسل کی قوتوں کا توڑ پیش کر سکے۔ انسانی رہن سہن کے بارے میں اسلام نے ہزار سال میں زیادہ اہم کام کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت دو ہزار برس یا اس سے زیادہ عرصے میں نہ کر سکے۔ یہ کسی معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان مراکش میں خود کو اتنا ہی بے تکلف پاتا ہے کہ جیسے وہ اپنے گھر

میں ہونسل اور زبان کے فرق کے باوصف۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام کلیتاً نسل کے خلاف ہے۔ اس کی تاریخ بتاتی ہے کہ معاشرتی اصلاح کے ضمن میں یہ بتدریج نسل پرستی کے خاتمہ پر دھیان دیتا ہے اور ایسے خطوط پر آگے بڑھتا ہے جہاں کم سے کم مزاحمت کا خطرہ ہو۔ قرآن کریم کہتا ہے:

''یقیناً ہم نے تمھیں قبیلوں اور ذیلی قبیلوں میں پیدا کیا تا کہ تمھارا تعارف ہو سکے لیکن اللہ کی نظر میں تم میں سے بہترین وہ ہے جو زندگی میں پاکیزہ ترین ہے۔''

یہ سوچتے ہوئے کہ نسل کا مسئلہ اس قدر بڑا اور مہیب ہے نوع انسانی کو اس سے نجات دلانے کے لیے ناگزیر طور پر وہی رویہ اختیار کرنا ہوگا جو اسلام نے اس مسئلہ کے حق میں اپنایا یعنی خود نسل کی تشکیل کا عنصر بنے بغیر اسے تسخیر کر لیا جائے۔ یہ واحد اور قابل عمل رویہ ہے۔ سر آرتھر کیتھ کی چھوٹی سی کتاب ''مسئلہ نسل'' میں ایک عمدہ عبارت ہے جو یہاں ذکر کرنے کے لائق ہے۔

''اور اب انسان اس حقیقت سے روشناس ہو رہا ہے کہ قدرت کا ابتدائی مقصد، تعمیر نسل، جدید اقتصادی دنیا کے تقاضوں سے لگا نہیں کھاتا اور خود سے یہ سوال کر رہا ہے: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تعمیر نسل کو جسے اب تک قدرت نے اپنا شعار بنائے رکھا ختم کر دیا جائے اور داعی امن کو اپنا لیا جائے یا قدرت کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی پرانی راہ پر گامزن رہے اور نتیجتاً جنگ کا مزہ چکھتا رہے۔ انسان کو ان دو میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔''

لہٰذا یہ بالکل واضح ہے کہ اگر اتا ترک تورانیت سے متاثر ہوئے تو وہ اتنا روح اسلام کے خلاف نہیں گئے جتنا زمانے کی روح کے خلاف گئے اور اگر وہ نسل پرستی میں کلی یقین رکھتے ہیں تو انھیں جدید عہد کے ہاتھوں یقینی شکست کا سامنا کرنا پڑے گا جو روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ تاہم ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ اتا ترک پان تورانیت سے متاثر ہوئے ہوں گے جیسا کہ میں باور کرتا ہوں کہ یہ ایک سیاسی توڑ ہے پان۔ سلاویت کا، یا پان جرمنیت کا، یا پان اینگلوسیکسونیت کا۔

اگر مندرجہ بالا پیرا گراف کا مطلب صحیح صحیح سمجھ لیں تو قوم پرستانہ تصورات کے بارے میں اسلام کے رویے کو سمجھنا دشوار نہیں ہوگا۔ قوم پرستی، حب الوطنی کی خاطر بلکہ اس کے وقار کے تحفظ کے لیے جان قربان کر دینے سے گریز نہ کرنا مسلمانوں کے ایمان کا جزو ہے۔ یہ اسی وقت اسلام

سے متصادم ہوتا ہے جب یہ ایک سیاسی موقف کا روپ دھار لیتا ہے اور انسانی یک جہتی کے اصول کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ اسلام محض ایک نجی رائے کی حیثیت سے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک زندہ عنصر کے طور پر ختم ہو جائے۔ ترکی، فارس (ایران) مصر اور دیگر مسلم ممالک میں یہ ہرگز مسئلہ نہیں بنے گا۔ ان ممالک میں مسلمان عظیم اکثریت میں ہیں اور ان کی اقلیتیں یعنی یہودی، عیسائی اور زرتشتی یا اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب کی مانند، جن سے شریعت اسلام آزاد معاشرتی تعلقات استوار کرنے کی اجازت دیتا ہے بشمول شادی بیاہ کے۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بن جاتا ہے صرف ان ممالک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور قوم پرستی مکمل طور پر خود کو مٹا دینے کا تقاضا کرتی ہے۔ اکثریتی ممالک میں اسلام قوم پرستی کے ساتھ رعایت برتتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قوم پرستی عملاً ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اقلیتی ملکوں میں اس کے لیے ایک ثقافتی وحدت کی حیثیت سے خود اختیاریت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ بہر صورت یہ خود سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

مذکورہ بالا عبارتیں مختصراً ٹھیک ٹھیک صورت حال پیش کرتی ہیں جو آج عالم اسلام میں موجود ہے۔ اگر اسے صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ اسلامی یک جہتی کے بنیادی اصولوں کو خارجی یا داخلی قوتیں کسی طرح سے بھی متزلزل نہیں کرتیں۔ اسلام کی یک جہتی، جیسا کہ میں نے پہلے وضاحت کی، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر یکساں عقیدے کے ساتھ اور نہایت ہی معروف ۵/ ارکان دین یعنی نماز پنجگانہ کی ادائیگی۔ یہ اسلامی یک جہتی کے پہلے ناگزیر اصول تھے، جو ایک اعتبار سے رسول اکرم ﷺ کے زمانے سے رائج رہے تا آنکہ بہائیوں نے فارس (ایران) میں اور قادیانیوں نے ہند میں انھیں درہم برہم کر دیا۔ یہ ضمانت ہے عملاً عالم اسلام میں یکساں روحانی ماحول کے قیام کی، یہ مسلم ممالک میں اتحاد کی سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ یہ اتحاد یا تو ایک عالمی ریاست کا روپ دھار سکتا ہے (معیار کمال) یا مسلم ممالک کی ایک لیگ یا متعدد آزاد ریاستیں جن کے معاہدے اور اشتراک خالصتاً اقتصادی اور سیاسی اسباب متعین کریں گے۔ اس طرح سے اس سیدھے سادے دین کے تصوراتی ڈھانچے کا مرور زمانہ سے ربط قائم کیا گیا۔ اس تعلق کی گہرائی کا ادراک بعض آیات قرآنی کی روشنی میں ہی ممکن

ہے جنھیں یہاں بیان کرنے کا مطلب ہوگا کہ ہم اس نکتے سے ہٹ گئے جو فوری طور سے ہمارے سامنے موجود ہے۔سیاسی طور پر اسلامی یک جہتی کی جڑ بنیاد اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب دو مسلم ملک ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔مذہبی لحاظ سے یہ عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب مسلمان کسی ایک بنیادی عقیدے کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے ہیں۔ یہ بات دائمی یک جہتی کے مفاد میں ہے کہ اسلام اپنی صفوں میں ایسے باغیوں کو برداشت نہ کرے۔اسلامی زمرے سے باہر ایسا گروہ اتنی ہی رواداری کا مستحق ہے جتنا کسی اور مذہب کے پیروکار۔مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فی الوقت اسلام ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے۔وہ سیاسی یک جہتی کی ایک شکل سے کسی دوسری میں منتقل ہو رہا ہے جسے تاریخ کی قوتوں کو ابھی متعین کرنا ہے۔جدید دنیا میں واقعات اس سرعت سے رونما ہو رہے ہیں کہ اس بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا بھی کم و بیش ناممکن ہے۔جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سیاسی طور پر متحد اسلام کا غیر مسلموں کے بارے میں کیا رویہ ہوگا، اگر ایسی کوئی چیز ظہور پذیر ہوتی ہے، اس کا جواب بھی محض تاریخ ہی دے سکتی ہے۔میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان واقع ہونے اور زندگی پر مشرقی اور مغربی تصورات کے جزو لاینفک ہونے کے باعث اسلام کو رابطے کا کردار ادا کرنا چاہیے لیکن پھر کیا ہوگا اگر یورپ کی حماقتوں نے ناقابل مصالحت اسلام تخلیق کر دیا جیسا کہ یورپ میں روز بروز واقعات نشوونما پا رہے ہیں۔ان کا تقاضا ہے کہ اسلام کی جانب یورپ کے رویے میں ایک انقلابی تبدیلی آنی چاہیے۔ہم صرف یہ توقع ہی کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت خود کو سامراجی خواہش یا اقتصادی استحصال کے تقاضوں کے دھندلکے میں گم نہیں ہونے دے گی۔ جہاں تک ہند کا تعلق ہے میں ایک بات پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم ہند ہرگز کسی ایسے سیاسی نظریے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرے گا جو ان کے ثقافتی وجود کو فنا کر دینے کے درپے ہو۔اس امر کے تیقن کے بعد آپ ان پر اس بارے میں اعتماد کر سکتے ہیں کہ انھیں اس کا علم ہے کہ کس طرح مذہب اور حب الوطنی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔نہرو نے لکھا تھا ”مجھے ایک عرصے سے یہ مبہم سا خیال تھا کہ وہ (آغا خان) بمشکل ہی پرانے زمرے میں شامل ہوں اور میں نے ان کی اس بات کو سراہا کہ واقعی وہ کس عمدہ طریقے سے وہ چیزیں جمع کر لیتے ہیں اور کس احسن انداز میں اپنی ذات میں وہ متضاد صفات سمو لیتے ہیں جو ایک

دوسرے کے خلاف نظر آتی ہیں اور نا قابل مصالحت دکھائی دیتی ہیں'' (ماڈرن ریویو کلکتہ، نومبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۵۰۵ (ایڈیٹر)۔ ہزائی نیس آغا خان کے بارے میں صرف ایک بات۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو آغا خان پر حملہ کرنے کی کیا سوجھی میرے لیے یہ معلوم کرنا مشکل بات ہے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ بدیہی طور پر اس امر سے واقف نہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی توجیہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ دائمی امامت پر یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اللہ کی طرف سے نہ امام کو وحی آتی ہے اور نہ الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف قانوں کا شارح ہے۔ چند روز قبل کی بات ہے کہ الہ آباد کے اسٹار، مورخہ ۱۲/مارچ ۱۹۳۴ء کے مطابق آغا خان نے اپنے مقلدوں کو یہ تلقین کی: ''اس امر کی شہادت دیجیے کہ اللہ ایک ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے، کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ آپ مسلمان ہیں اور آپ کو مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ السلام علیکم، کہہ کر مسلمانوں کو خوش آمدید کہیے۔ اپنے بچوں کو اسلامی نام دیجیے۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں نماز پڑھیے۔ باقاعدگی کے ساتھ روزے رکھیے۔ اپنی شادیاں نکاح کے اسلامی ضوابط کے ساتھ کیجیے۔ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھئے۔''

اب یہ فیصلہ کرنا پنڈت کا کام ہے کہ آغا خان اسلامی یک جہتی کی ترجمانی کرتے ہیں یا نہیں۔

(٦)

احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

۲۱؍جون ۱۹۳۶ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا، بالخصوص آپ کو کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتدا ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہو گئے کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریک احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا تاکہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکنے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گذشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی خدشہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔

مسابقہ اربعین ختم نبوت 2023ء

(غلام قادر ساقی)

دوسرا سالانہ مسابقہ 16,17 ستمبر بروز ہفتہ اتوار کو طے پایا، شرکاء کی تعداد تقریباً 40 ہوئی جبکہ فائنل نشست میں 20 طلباء شرکت کے مجاز ٹھہرے۔ نشست اوّل ہفتہ بعداز مغرب سے رات 1:00 بجے تک جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور جاری رہی جس میں منصف کے فرائض پروفیسر محمد امین بھٹی، مولانا محمد شفیع نذر اور مفتی محمد رمضان غفاری نے ادا کیے جبکہ فائنل راؤنڈ اتوار صبح 9:00 تا 1:00 بجے تک زم زم مارکی میں (نزد جامعہ رحمت) چلا۔ ججز حضرات میں ڈاکٹر مفتی محمد حسیب قادری، مفتی عبدالغفار نقشبندی اور مفتی محمد غلام رسول اشرفی تھے اس بار احادیث کی تعداد بڑھ کر 50 کر دی گئی تھی اور ادارہ کی جانب سے سہ ماہی "المنتہیٰ" جولائی تا دسمبر بطور نصاب اسپیشل نمبر شائع کیا گیا۔

دونوں مسابقوں کی مکمل ویڈیو تیار ہوئی مزید برآں شرکاء کی مکمل تفصیلات کی فائلیں ادارہ کے پاس بطور ریکارڈ محفوظ ہیں۔ دوسرے مسابقہ کے فائنل شرکاء کے نام حسب ذیل ہیں۔

1- حافظ محمد وسیم ولد محمد یوسف

(جامعہ نظامیہ رضویہ اندرون لوہاری گیٹ لاہور)

2- عمیر ظہیر ولد ظہیر احمد

(ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہید انسٹیٹیوٹ اسلامک سائنسز)

3- محمد عقیل خان ولد محمد خان

(جامعہ مدینۃ العلم بائپاس روڈ نزد عالم چوک گوجرانوالہ)

4- محمد محسن رضا ولد محمد یسٰین

(جامعہ غوثیہ رضویہ مین مارکیٹ گلبرگ ٹو لاہور)

-5 حافظ علی ولد محمد ریاض

(جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور)

-6 فیاض احمد ولد بشیر

(جامعۃ الحبیب حبیب آباد چونیاں روڈ قصور)

-7 مزمل الرحمن ولد حبیب الرحمن

(جامعہ فریدیہ ساہیوال)

-8 عبد الصمد ولد محمد ندیم

(دار العلوم شمسیہ رضویہ کینٹی روڈ سلانوالی)

-9 محمد فیضان علی ولد محمد اقبال

(جامعہ قمریہ رضویہ منظور الحق چانن پورہ سلانوالی)

-10 محمد دانیال ریاض والد محمد ریاض

(جامعہ رضویہ قمر الاسلام تحصیل سلانوالی ضلع سرگودھا)

-11 علی بلال ولد رحمت علی

(جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور)

-12 حامد اللہ ولد صابر علی

(جامع رحمت ٹاؤن شپ لاہور)

-13 محمد حسن ولد عبد الرزاق

(جامعہ صدیقہ دلو خورد برانچ جامعہ ام اشرف جمال)

-14 محمد عبد الحنان ولد محمد شہزاد

(جامعہ صدیقہ دلو خورد برانچ جامعہ ام اشرف جمال)

-15 ماہیر احمد والد محمد اکرم

(جامعہ فخر العلوم تضائیہ نقشبندیہ میاں پارک داروغہ والا لاہور)

-16 شاہ فیض الرحمن ولد تجمل انوار الحق

(جامعہ فخر العلوم تضائیہ نقشبندیہ میاں پارک داروغہ والا لاہور)

-17 مزمل ندیم ولد ندیم اختر

(دارالعلوم امینہ رضویہ کھبل اعوان)

-18 محمد ضیاء القمر ولد محمد یونس

(دارالعلوم امینہ رضویہ کھبل اعوان)

-19 محسن چشتی ولد سائیں احمد

(جامعہ رضویہ ماڈل ٹاؤن لاہور)

-20 محمد عدیل ولد محمد منشاء

(جامعہ فاطمیہ تعلیم القرآن مغلپورہ لاہور)

نوٹ: اللہ کریم کے فضل سے ''ادارۃ المنتہی پاکستان'' کے پلیٹ فارم سے اب تک تقریباً 80 خوش قسمت افراد عقیدہ ختم نبوت پر 50 احادیث سنداً متناً حفظ کر کے احادیث مبارکہ کے نور سے اپنے سینوں کو منور کر چکے ہیں۔ الحمدللہ تعالیٰ! اللہ کریم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

”وفائے ختم نبوت تربیتی نشست“

(محسن علی چشتی)

2 دسمبر 2023ء بروز ہفتہ بعد از نماز عشاء جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور ادارۃ المنتہیٰ پاکستان کے کارکنان کی سفیر ختم نبوت حضرت خواجہ غلام دستگیر فاروقی کے ساتھ خصوصی میٹنگ ہوئی جس میں اہم امور پر تبادلہ خیال کیا گیا اور کارکنان نے خصوصی طور پر تحفظ ختم نبوت و ناموس رسالت پر اپنی زندگیاں وقف کرنے کے لیے خواجہ صاحب کو حلف دیا۔

جانثاران ختم نبوت کے نام درج ذیل ہیں:

☆ قاری اکرام ☆ حسیب الرحمن ☆ محمد نعمان ☆ عامر علی چشتی
☆ محمد احمد ☆ کاشف علی ☆ شرافت علی ☆ قاری اویس
☆ محمد عاصم ☆ محمد قاسم ☆ محمد عبداللہ ☆ محمد مامون
☆ ظہیر احمد ☆ محمد راحیل ☆ قاری مجتبیٰ ☆ محمد محسن
☆ غلام قادر ☆ عامر فاروق ☆ محمد یار رضوی ☆ احسن
☆ غلام مرتضیٰ ☆ تصور حسین ☆ مولانا شریف نوری ☆ عدنان علی
☆ محمد فریاد ☆ محمد عبدالرحمن ☆ عمران سعید ☆ شہباز ڈھکو
☆ دانش علی ☆ محمد احسن شرفی ☆ محمد حسن ☆ محمد احسان
☆ سانول رسول ☆ محمد زین ☆ محمد سمیع الحق ☆ قیصر بلوچ
☆ محمد وقاص عباس ☆ محمد شہزاد ☆ شہزاد عفور ☆ محمد عمیر رضا
☆ عبدالرحمن ☆ محمد عاطف ☆ محمد شاہد عباس ☆ قاری فلک شیر
☆ حافظ محمد یاسر محمود ☆ قاری عاطف محمود ☆ حافظ عامر امیر ☆ حافظ ابوبکر
☆ مزمل رضا ☆ ماسٹر سعید ☆ محمد جواد احمد ☆ مدثر حسن
☆ قاری غلام شبیر ☆ عبداللہ حمزہ ☆ حافظ قیصر ☆ علی عباس

سپریم کورٹ کا فیصلہ (اعلامیہ)

(احسن سلطانی)

6 فروری 2024ء چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی سربراہی میں دو رکنی سپریم کورٹ کے بینچ نے جو فیصلہ دیا ہے وہ قرآن وسنت، ملکی قوانین اور آئین پاکستان سے کلی طور پر متصادم ہے۔ چیف جسٹس صاحب کو بجائے اس فیصلہ کے چاہیے کہ وہ قادیانیوں کو مکمل آئین پاکستان ماننے کا حکم دیتے کیوں کہ قادیانی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں جب وہ اپنی حیثیت غیر مسلم اقلیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اُنہیں اقلیتوں والے حقوق کیسے دیے جاسکتے ہیں۔

تحفظ ختم نبوت قانون کو موثر بنانے میں 1883ء سے لے کر تحریک ختم نبوت 1953ئ، 1974ئ، 1984ء (امتناع قادیانیت آرڈیننس) تک انتھک جدو جہد، لازوال قربانیوں اور شہدا کی ایک انمٹ طویل روشن فہرست ہے۔ بقول اقبال قادیانی اسلام اور وطن کے غدار ہیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے کہا! مرزائی پاکستان کو ختم کرنے میں روز اول سے مصروف ہیں منکرین ختم نبوت کی خلاف اسلام مذموم سرگرمیوں اور سازشوں کو روکنا وقت کا سب سے بڑا جہاد اور تبلیغ ہیں۔ سپریم کورٹ کے جج جسٹس فائز عیسی کا قادیانیت نواز فیصلہ اہل اسلام و پاکستان جذبہ عشق رسول سے معمور غلامان مصطفی کیلئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس قانون کی حفاظت کیلئے قسم بخدا ہماری جانیں حاضر ہیں، فیصلہ واپس لیا جائے نہیں تو دمادم مست قلندر ہوگا۔

ہم نے ہر دور میں تقدیس رسالت کے لیے وقت کی تیز ہواؤں سے بغاوت کی ہے
توڑ کر سلسلہ رسم سیاست کا فسوں اک فقط نام محمد سے محبت کی ہے

آئیں اقبال کا شعر گنگنائیں اور فیصلہ کو یکسر مسترد کریں

قوت عشق سے ہر پشت کو بالا کردے دہر محمد اسم محمد سے اجالا کردے

نوٹ: اس سلسلہ میں وطن عزیز کے تمام مکاتب فکر سے اٹھنے والی آوازوں کی ہم مکمل تائید

کرتے ہیں اور ملک بھر کی تمام حُبّ اسلام قیادت سے اپیل کرتے ہیں 23فروری جمعۃ المبارک کو بھرپور یوم احتجاج کے طور پر منایا جائے اور عوام وخواص پر واضح کیا جائے کہ منکرین ختم نبوت کو سپورٹ کرنے کی کسی بھی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔آپ کے قریب جو بھی تحریک ،فرد واحد تحفظ ختم نبوت کیلئے کوشاں ہے پہلی فرصت میں اس سے جڑ جائیے اور ہر قسم ی سیاسی وابستگی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آقا ومولی سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ سلم کی تقدیس رسالت اور حرمت قرآن کے لئے وقت دے کر سُرخرو ہوں۔

22فروری2024ء

نوٹ: ادارہ کے پلیٹ فارم سے ہنگامی بنیادوں پر 25فروری بروز اتوار ظہر تا عصر پروگرام(جامعہ رحمت ٹاؤن شپ لاہور) ترتیب دیا گیا۔جس میں خصوصی لیکچر قاطع قادیانیت محمد متین خالد حفظہ اللہ تعالیٰ نے دیا اور فیصلہ پر جرح کرکے سامعین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا یہ ایک گھنٹہ پر مشتمل لیکچر یوٹیوب پر موجود ہے۔

acknowledge it in your letter I fear it never reached you.

* Reproduced from Jawaharlal Nehru,A bunch of Old Letttrs (London, 1960), pp.
187-88(Ed).
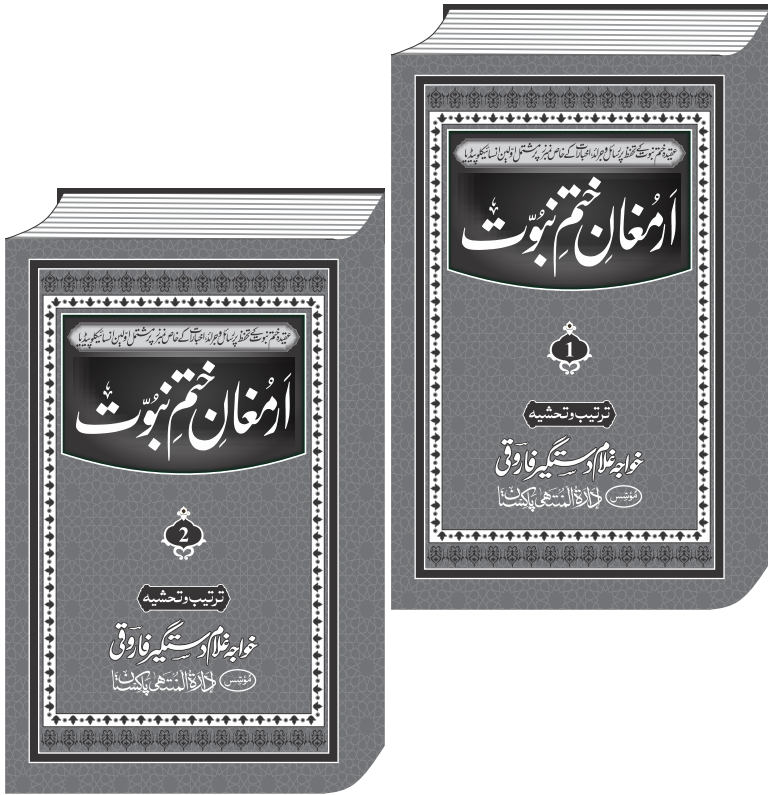
جلد سوئم عنقریب شائع ہوگی۔ان شاءاللہ

(6)
Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21st June, 1936. *

Thank you so much for your letter which I received yesterday. At the time I wrote in reply to your articles I Ahmadis. Indeed the main reason why I wrote a reply was to show, especially to you, how Muslim loyalty had originated and how eventually it had found a revelational basis in Ahmadism. After the publication of my paper I discovered, to my great surprise, that even the educated Muslims had no idea of the historical causes which had shaped the teachings of Ahmadism. Moreover your Muslim admirers in the Punjab and elsewhere felt perturbed over your articles as they thought you were in sympathy with the Ahmadiyya movement. This was mainly due to the fact that the Ahmadis were jubilant over your articles. The Ahmadi Press was mainly responsible for this misunderstanding about you. However I am glad to know that my impression was erroneous. I myself have little interest in theology, but had to dabble in it a bit in order to meet the Ahmadis on their own ground. I assure you that my paper was written with the best of intentions for Islam and India. I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.

I was extremely sorry to miss the opportunity of meeting you in Lahore. I was very ill in those days and could not leave my rooms. For the last two years I have been living a life practically of retirement on account of continued illness. Do let me know when you come to the Punjab next. Did you receive my letter regarding your proposed Union for Civil Liberties? As you do not

patriotism.

One word about His Highness the Agha Khan. What has led Pandit Jawahar Lal Nehru to attack the Agha Khan[7] it is difficult for me to discover. Perhaps he thinks that the Qadianis and the Isma'ilis fall under the same category. He is obviously not aware that however the theological interpretation of the Isma'ilis may err, they believe in the basic principles of Islam. It is true that they believe in a perpetual Imamate; but the lmam according to them is not a recipient of Divine revelation. He is only an expounder of the Law. It is only the other day (vide The Star of Allahahad, March 12, 1934) that His Highness the Agha Khan addressed his followers as follows:

7. Nehru had, inter alia, written: "I have long had a vague kind of idea ... that he (the Agha Khan), hardly belongs to the inner orthodox fold, and I have admired him for the truly wonderful way in which he manages to combine, and gracefully carry in his own person, the most contradictory qualities, and to take part in multifarious activities which appear to be mutually antagonistic and irreconcilable" (Modem Review, Calcutta, November 1935, p. 505(. (Ed.)

Bear witness that Allah is One, Muhammad is the Prophet of Allah. Quran is the Book of Allah. Kaaba is the Qibla of all. You are Muslims and should live with Muslims. Greet Muslims with Assalamo-o-'Alaikum

Give your children Islamic names. Pray with Muslim congregations in mosques. Keep fast regularly. Solemnize your marriages according to Islamic rules of nikah. Treat all Muslims as your brothers.

It is the Pandit now to decide whether the Agha Khan represents the solidarity of Islam or not.

can be understood only in the light of certain verses of the Quran which it is not possible to explain here without drifting away from the point immediately before us. Politically, then, the solidarity of Islam is shaken only when Muslim States war on one another; religiously it is shaken only when Muslims rebel against any of the basic beliefs and practices of the Faith. It is in the interest of the eternal solidarity that Islam cannot tolerate any rebellious group within its fold. Outside the fold such a group is entitled to as much toleration as the followers of any other faith. It appears to me that at the present moment Islam is passing through a period of transition. It is shifting from one form of political solidarity to some other form which the forces of history have yet to determine. Events are so rapidly moving in the modern world that it is almost impossible to make a prediction. As to what will be the attitude towards non-Muslims of a politically united Islam, if such a thing ever comes, is a question which history alone can answer. All that I can say is that, tying midway between Asia and Europe and being a synthesis of Eastern and Western outlooks on life, Islam ought to act as a kind of intermediary between the East and the West. But what if the follies of Europe create an irreconcilable Islam? As things are developing in Europe from day to day they demand a radical transformation of Europe's attitude towards Islam. We can only hope that political vision will not allow itself to be obscured by the dictates of imperial ambition or economic exploitation. In so far as India is concerned I can say with perfect confidence that the Muslims of India will not submit to any kind of political idealism which would seek to annihilate their cultural entity. Sure of this they may be trusted to know how to reconcile the claims of religion and

Jews, Christians and Zoroastrians, according to the law of Islam, are either “People of the Book” or “like the People of the Book” with whom the law of Islam allows free social relations including matrimonial alliances. It becomes a problem for Muslims only in countries where they happen to be in a minority, and nationalism demands their complete self-effacement. In majority countries Islam accommodates nationalism; for there Islam and nationalism are practically identical; in minority countries it is .justified in seeking self determination as a cultural unit. In either case, it is thoroughly consistent with itself.

The above paragraphs briefly sum up the exact situation in the world of Islam to-day. If this is properly understood it will become clear that the fundamentals of Islamic solidarity. are not in any way shaken by any external or internal forces. The solidarity of Islam, as I have explained before, consists in a uniform belief in the two structural principles of Islam supplemented by the five well-known “practices of faith”. These are the first essentials of Islamic solidarity which has, in this sense, existed ever since the days of the Holy Prophet until it was recently disturbed by the Bahais in Persia and the Qadianis in India. It is a guarantee for a practically uniform spiritual atmosphere in the world of Islam. It facilitates the political combination of Muslim States, which combination may either assume the form of a world-State (ideal) or of a league of Muslim States, or of a number of independent States whose pacts and alliances are determined by purely economic and political considerations. That is how the conceptual structure of this simple faith isrelated to the process of time. The profundity of this relation

And now man is awakening to the fact that Nature's primary end—race-building—is incompatible with the necessities of the modern economic world and is asking himself: What must I do? Bring race-building as practised hitherto by nature to an end and have eternal peace? Or permit Nature to pursue old course and have, as a necessary consequence—War? Man has to choose the one course or the other. There is no intermediate course possible.

It is, therefore, clear that if the Ataturk is inspired by Pan-Turanianism he is going not so much against the spirit of Islam as against the spirit of the times. And if he is a believer in the absoluteness of races, he is sure to be defeated by the spirit of modern times which is wholly in keeping with the spirit of islam. Personally, however, I do not think that the Ataturk is inspired by Pan-Turanianism, as I believe his Pan-Turanianism is only a political retort to Pan-Slavonism or Pan-Germanism, or Pan-Anglo-Saxonism.

If the meaning of the above paragraph is well understood it is not difficult to see the attitiude of Islam towards nationalist ideals. Nationalism in the sense of love of one's country and even readiness to die for its honour is a part of the Muslim's faith; it comes into conflict with Islam only when it begins to play the role of a political concept and claims to be a principle of human solidarity demanding that Islam should recede to the background of a mere private opinion and cease to be a living factor in the national life. In Turkey, Persia, Egypt and other Muslim countries it will never become a problem. In these countries Muslims constitute an overwhelming majority and their minorities, i.e.

nationalist ideals. He seems to think that the adoption of such ideals means the abandonment of Islam by Turkey and Persia. The student of history knows very well that Islam was horn at a time when the old principles of human unification, such as blood-relationship and throne-culture, were failing. It, therefore, finds the principle of human unification not in the blood and hones hut in the mind of man. Indeed its social message to mankind is: “Deracialise yourself or perish by internecine war.” It is no exaggeration to say that Islam looks askance at Nature's race-building plans and creates, by means of its peculiar institutions, an outlook which would counteract the race building forces of nature. In the direction of human domestication it has done in one. thousand years far more important work than Christianity and Buddhism ever did in two thousand years or more. lt is no less than a miracle that an Indian Muslim finds himself athome in Morocco in spite of the disparity of race and language. Yet it cannot be said that Islam is totally opposed to race. Its history shows that in social reform it relies mainly on its scheme for gradual deracialisation and proceeds on the lines of least resistance. “Verily,” says the Quran, “We have made you into tribes and sub-tribes so that you may be identified; but the best among you in the eye of God is he who is the purest in life.” Considering the mightiness of the problem of race and the amount of time which the deracialisation of mankind must necessarily take, the attitude of Islam towards the problem of race, i.e. stooping to conquer without itself becoming a race-making factor, is the only rational and workable attitude. There is a remarkable passage in Sir Arthur Keith's little book, The Problem of Race, which is worth quoting here:

origin. The metaphysical dualism on which the European idea is based has borne bitter fruit among Western nations. Many years ago a book was written in America called If christ came to Chicago. In reviewing this book an American author says:

The lesson to be learned from Mr. Stead's book is that the great evils from which humanity is suffering today are evils that can be handled only by religious sentiments; that the handling of those evils has been in the great part surrenderedto the State; that the State has itself been delivered over to corrupt political machines; that such machines are not only unwilling, but unable, to deal with those evils; and that nothing hut a religious awakening of the citizens to their public duties can save countless millions from misery, and the State itself from degradation.

In the history of Muslim political experience this separation has meant only a separation of functions, not of ideas. It cannot be maintained that in Muslim countries the separation of Church and State means the freedom of Muslim legislative activity from the conscience of the people which has for centuries been trained and developed by the spirituality of Islam. Experience alone will show how the idea will work in modern Turkey. We can only hope that it will not he productive of the evils which it has produced in Europe and America.

I have briefly discussed the above innovations more for the sake of the Muslim reader than for Pandit Jawahar Lal Nehru. The innovation specifically mentioned by the Pandit is the adoption by the Turks and Persians of racial and

Islam: (1) That Universal Imamate is a Divine institution and is consequently indispensable. (2) That it is merely a matter of expediency. (3) That there is no need of such an institution. The last view was taken by the Khawarij, the early republicans of Islam. It seems that modern Turkey has shifted from the first to the second view, i.e., to the view of the Muttazilla who regarded Universal Imamate as a matter of expediency only. The Turks argue that in our political thinking we must be guided by our past political experience which points unmistakably to the fact that the idea of Universal Imamate has failed in practice. It was a workable idea when the Empire of Islam was intact. Since the break-up of this Empire independent political units have arisen. The idea has ceased to be operative and cannot work as a living factor in the organization of modern Islam.

6.Reconstruction of Religious Thought in Islam, p. 149-50.

Nor is the idea of separation of Church and State alien to Islam. The doctrine of the Major Occultation of the Imam in a sense effected this separation long ago in Shi'a Persia. The Islamic idea of the division of the religious and political functions of the State must not be confounded with the European idea of the separation of Church and State. The former is only a division of functions as is clear from the gradual creation in the Muslim State of the offices of Shaikh-ul-Islam and Ministers; the latter is based on the metaphysical dualism of spirit and matter. Christianity began as an order of monks having nothing to do with the affairs of the world; Islam was, from the very beginning, a civil society with laws civil in their nature though believed to be revelational in

largely due the stupidity of the average Muslim. In excluding him from the religious life of the people the Ataturk has done what would have delighted the heart of an Ibn-i-Taimiyya or a Shah Wali Ullah. There is a tradition of the Holy Prophet reported in the Mishkat to the effect that only the Amir of the Muslim State and the person or persons appointed by him are entitled to preach to the people. I do not know whether the Ataturk ever knew of this tradition; yet it is striking how the light of his Islamic conscience has illumined the zone of his action in this important matter. The adoption of the Swiss code with its rule of inheritance is certainly a serious error which has arisen out of the youthful zeal for reform excusable in a people furiously desiring to go ahead. The joy of emancipation from the fetters of a long-standing priest-craft sometimes drives a people to untried courses of action. But Turkey as well as the rest of the world of Islam has yet to realise the hitherto unrevealed economic aspects of the Islamic law of inheritance which Von Kremer describes as the "supremely original branch of Muslim law." Is it the abolition of the Caliphate or the separation of Church and State? In its essence Islam is not Imperialism. In the abolition of the Caliphate which since the days of Omayyads had practically become a kind of Empire it is only the spirit of Islam that has worked out through the Ataturk. In order to understand the Turkish Ijtihad in the matter of the Caliphate we cannot but seek the guidance of Ibn-i Khaldun—the great philosophical historian of Islam, and the father of modern history. I can do no better than quote here a passage from my Reconstruction:[6]

Ibn-i-Khaldun, in his famous Prolegornena, mentions three distinct views of the idea of Universal Caliphate in

of the Quran are believed to be erroneous. But perhaps Pandit Jawahar Lal Nehru has in his mind the supposed or real innovations which the Ataturk has introduced. Let us for a moment examine these. Is it the development of a general materialist outlook in Turkey which seems inimical to Islam? Islam has had too much of renunciation; it is time for the Muslims to look to realities. Materialism is a bad weapon against religion; but it is quite an effective one against mulla-craft and Sufi-craft which deliberately mystify the people with a view to exploit their ignorance and credulity. The spirit of Islam is not afraid of its contact with matter. Indeed the Quran says: "Forget not thy share in the world." It is difficult for a non-Muslim to understand that, considering the history of the Muslim world during the last few centuries, the progress of a materialist outlook is only a form of self-realisation. Is it then the abolition of the old dress or the introduction of the Latin script? Islam as a religion has no country; as a society it has no specific language, no specific dress. Even the recitation of the Quran in Turkish is not without some precedent in Muslim history. Personally I regard it as a serious error of judgment; for the modern student of the Arabic language and literature knows full well that the only non-European language which has a future is Arabic. But the reports are that the Turks have already abandoned the vernacular-recitation of the Quran. Is it then the abolition of polygamy or the licentiate ulema? According to the Law of Islam the Amir of a Muslim State has the power to revoke the "permission" of the law if he is convinced that they tend to cause social corruption As tothe licentiate ulema I would certainly introduce it in Muslim India if I had the power to do so. The inventions of the myth-making mulla is

had the courage to rush into sun-lit space and do, even by force, what the new conditions of life demanded. Such men are liable to make mistakes; but the history of nations shows that even their mistakes have sometimes borne good fruit. In them it is not logic but life that struggles restless to solve its own problems. It may be pointed out here that Syed Ahmad Khan, Syed Jamal-ud-Din Afghani and hundreds of the latter's disciples in Muslim countries were not westernised Muslims. They were men who had sat on their knees before the mullas of the old school and had breathed the very intellectual and spiritual atmosphere which they later sought to reconstruct. Pressure of modern ideas may be admitted; but the history thus briefly indicated above clearly shows that the upheaval which has come to Turkey and which is likely, sooner or later, to come to other Muslim countries, is almost wholly determined by the forces within, It is only the superficial observer of the modern world of Islam who thinks that the present crisis in the world of Islam is wholly due to the working of alien forces.

Has then the world of Islam outside India, or especially Turkey, abandoned Islam? Pandit Jawahar Lal Nehru thinksthat Turkey had ceased to be a Muslim country. He does not seem to realise that the question whether a persons or a community has ceased to be a member of Islam is, from the Muslim point of view, a purely legal question and must be decided in view of the structural principles of Islam. As long as a person is loyal to the two basic principles of Islam, i.e. the Unity of God and Finality of the Holy Prophet, not even the strictest mulla can turn him outside the pale of Islam even though his interpretations of the Law or of the text

reinterpret the law in the light of advancing experience.

(ii) Mysticism —The masses of Islam were swayed by the kind of mysticism which blinked actualities, enervated the people and kept them steeped in all kinds of superstition. From its high state as a force of spiritual education mysticism had fallen down to a mere means of exploiting the ignorance and the credulity of the people. It gradually and invisibly unnerved the will of Islam and softened it to the extent of seeking relief from the rigorous discipline of the law of Islam. The nineteenth-century reformers rose in revolt against this mysticism and called Muslims to the broad daylight of the modern world. Not that they were materialists. Their mission was to open the eyes of the Muslims to the spirit of Islam which aimed at the conquestof matter and not flight from it.

(iii) Muslim Kings — The gaze of Muslim Kings was solely fixed on their own dynastic interests and, so long as these were protected, did not hesitate to sell their countries to the highest bidder. To prepare the masses of Muslims for a revolt against such a state of things in the world of Islam was the special mission of Syed Jamal-ud-Din Afghani.

It is not possible here to give a detailed account of the transformation which these reformers brought about in the world of Muslim thought and feeling. One thing, however, is clear. They prepared to a great extent the ground for another set of men, i.e. Zaghlul Pasha, Mustafa Kamal and Raza Shah. The reformers interpreted, argued and explained but the set of men who came after them, although inferior in academic learning, were men who, relying on their healthy instincts,

thought and action, was born in Afghanistan! A perfect master of nearly all the Muslim languages of the world and endowed with the most winning eloquence, his restless soul migrated from one Muslim country to another influencing some of the most prominent men in Persia, Egypt and Turkey. Some of the greatest theologians of our time, such as Mufti Muhammad 'Abduhu, and some of the men of the younger generation who later became political leaders, suchas Zaghlul Pasha of Egypt, were his disciples. He wrote little, spoke much and thereby transformed into miniature Jamalud-Dins all those who came into contact with him. He never claimed to be a prophet or a renewer; yet no man in our time has stirred the soul of Islam more deeply than he! His spirit is still working in the world of Islam and nobody knows where it will end.

It may, however, be asked what exactly was the objective of these great Muslims. The answer is that they found the world of Islam ruled by three main forces and they concentrated their whole energy on creating a revolt against these forces.

(i) Mullaism.— The ulema have always been a source of great strength to Islam. But during the course of centuries, especially since the destruction of Baghdad, they became extremely conservative and would not allow any freedom of Ijtihad i.e. the forming of independent judgment in matters of law. The Wahabi movement which was a source of inspiration to the nineteenth-century Muslim reformers was really a revolt against this rigidity of the Ulema. Thus the first objective of the nineteenth-century Muslim reformers was a fresh orientation of the faith and a freedom to

on the whole confined to India. It is probable,however, that he was the first modern Muslim to catch a glimpse of the positive character of the age which was coming. The remedy for the ills of Islam proposed by him, as by Mufti Alam Jan in Russia, was modern eduction. But the real greatness of the man consists in the fact that he was the first Indian Muslim who felt the need of a fresh orientation of Islam and worked for it. We may differ from his religious views, but there can be no denying the fact that his sensitive soul was the first to react to the modern age.

The extreme conservatism of Indian Muslims which had lost its hold on the realities of life failed to see the real meaning of the religious attitude of Syed Ahmad Khan. In the North-West of India, a country more primitive and more saint-ridden than the rest of India, the Syed's movement was soon followed by the reaction of Ahmadism—a strange mixture of Semitic and Aryan mysticism with whom spiritual revival consists not in the purification of the individual's inner life according to the principle of the old Islamic Sufism, but in satisfying the expectant attitude of the masses by providing a "promised Messiah." The function of this "promised Messiah" is not to extricate the individual from an enervating present but to make him slavishly surrender his ego to its dictates. This reaction carries within itself a very subtle contradiction. It retains the discipline of Islam but destroys the will which that discipline was intended to fortify.

Maulana Syed Jamal-ud-Din Afghani was a man of a different stamp. Strange are the ways of Providence. One of the most advanced Muslims of our time, both in religious

III

Let me now turn to Pandit Jawahar Lal Nehru's questions. I fear the Pandit's articles reveal practically no acquaintance with Islam or its religious history during the nineteenth century. Nor does he seem to have read what I have already written on the subject of his questions. It is not possible for me to reproduce here all that I have written before. Nor is it possible to write here a religious history of Islam in the nineteenth century without which a thorough understanding of the present situation in the world of Islam is impossible. Hundreds of books and articles have been written on Turkey and modern Islam. I have read most of this literature and probably the Pandit has also read it. I assure him, however, that not one of these writers understands the nature of the effect or of the cause that has brought about that effect. It is, therefore, necessary to briefly indicate the main currents of Muslim thought in Asia during the nineteenth century.

I have said above that in the year 1799 the political decay of Islam reached its climax. There can, however, be no greater testimony to the inner vitality of Islam than the fact that it practically took no time to realise its position in the world. During the nineteenth century were born Syed Ahmad Khan in India, Syed Jamal-ud-Din Afghani in Afghanistan and Mufti Alam Jan in Russia. These men were probably inspired by Muhammad ibn Abdul Wahab who was born in Nejd in 1700, the founder of the so-called Wahabi movement which may fitly be described as the first throb of life in modern Islam. The influence of Syed Ahmad Khan remained

theological problems which had absolutely no bearing onlife. Islam has already passed into the broad daylight of fresh thought and experience; and no saint or prophet can bring it back to the fogs of mediaeval mysticism.

the rotten state of a people's will who are, on the basis of Divine authority, made to accept their political environment as final. Thus all the actors who participated in the drama of Ahmadism were, I think, only innocent instruments in the hands of decadence. A similar drama had already been acted in Persia; but it did not lead, arid could not have led, to the religious and political issues which Ahmadism has created for Islam in India. Russia offered tolerance to Babism and allowed the Babis to open their first missionary centre in Ashkabad. England showed Ahmadis the same tolerance in allowing them to open their first missionary centre in Woking. Whether Russia and England showed this tolerance on the ground of imperial expediency or pure broad-mindedness is difficult for us to decide. This much is absolutely clear that this tolerance has created difficult problems for Islam in Asia. In view of the structure of Islam, as I understand it, I have not the least doubt in my mind that Islam will emerge purer out of the difficulties thus created for her. Times are changing. Things in India have already taken a new turn. The new spirit of democracy which is coming to India is sure to disillusion the Ahmadis and to convince them of the absolute futility of their theological inventions.

Nor will Islam tolerate any revival of mediaeval mysticism which has already robbed its followers of their healthy instincts and given them only obscure thinking in return. It has, during the course of the past centuries, absorbed the best minds of Islam leaving the affairs of the State to mere mediocrities. Modern Islam cannot afford to repeat the experiment. Nor can it tolerate a repetition of the Punjab experiment of keeping Muslims occupied for half a century in

Indian Muslims of reactionary conservatism. I have no doubt that if he had grasped the real nature of Ahmadism he would have very much appreciated the attitude of Indian Muslims towards a religious movement which claims Divine authority for the woes of India.

Thus the reader will see that the pallor of Ahmadism which we find on the cheeks of Indian Islam today is not an abrupt phenomenon in the history of Muslim religious thought in India. The ideas which eventually shaped themselves in the form of this movement became prominent in theological discussions long before the founder of Ahmadism was born. Nor do I mean to insinuate that the founder of Ahmadism and his companions deliberately planned their programme. I dare say the founder of the Ahmadiyya movement did hear a voice; but whether this voice came from the God of Life and Power or arose out of the spiritual impoverishment of the people must depend upon the nature of the movement which it has created and the kind of thought and emotion which it has given to those who have listened to it. The reader must not think that I am using metaphorical language The live-history of nations shows that when the tide of life in a people beings to ebb, decadence itself becomes a source of inspiration, inspiring their poets, philosophers, saints, statesmen, and turning them into a class of apostles whose sole ministry is to glorify,by the force of a seductive art of logic, all that is ignoble and ugly in the life of their people. Those apostles unconsciously clothe despair in the glittering garment of hope, undermine the traditional values of conduct and thus destroy the spiritual virility of those who happen to be their victims. One can only imagine

significance of the movement, the Ahmadi belief that Christ died the death of an ordinary mortai, and that his second advent means only the advent of a person who is spiritually "like unto him," gives the movement some sort of a rational appearance; but they are not really essential to the spirit of the movement, in my opinion they are only preliminary steps towards the idea of full prophethood which alone can serve the purposes of the movement eventually brought into being by new political forces. In primitive countries it is not logic but authority that appeals. Given a sufficient amount of ignorance, credulity which strangely enough sometimes co-exists with good intelligence, and a person sufficiently audacious to declare himself a recipient of Divine revelation whose denial would entail eternal damnation, it is easy, in a subject Muslim country, to invent a political servility. And in the Punjab even an ill-woven net of vague theological expressions can easily capture the innocent peasant who has been for centuries exposed to all kinds of exploitation.

Pandit Jawahar Lal Nehru advises the orthodox of all religions to unite and thus to delay the coming of what he conceives to be Indian nationalism. This ironical advice assumes that Ahmadism is a reform movement; he does not know that as far as Islam in India is concerned, Ahmadism involves both religious and political issues of the highest importance. As I have explained above, the function of Ahmadism in the history of Muslim religious thought is to furnish a revelational basis for India's present political subjugation. Leaving aside the purely religious issues, on the ground of political issues alone, I think, it does not lie in the mouth of a indian like Pandit Jawahar Lal Nehru to accuse

masters of the affairs (i.e. rulers) from amongst you?" What is the character of the traditions of the Prophet foretelling the advent of Imam Mehdi? These questions and some others which arose subsequently were, for obvious reasons, questions for Indian Muslims only. European imperialism, however, which was then rapidly penetrating the world of Islam was also intimately interested in them. The controversies which these questions created form a most interesting chapter in the history of Islam in India. The story is a long one and is still waiting for a powerful pen. Muslim politicians whose eyes were mainly fixed on the realities of the situation succeeded in winning over a section of theulema to adopt a line of theological argument which, as they thought, suited the situation; but it was not easy to conquer by mere logic the beliefs which had ruled for centuries the conscience of the masses of Islam in India. In such a situation logic can either proceed on the ground of political expediency or on the lines of a fresh orientation of texts and traditions. In either case the argument will fail to appeal to the masses. To the intensely religious masses of Islam only one thing can make a conclusive appeal, and that is Divine Authority. For an effective eradication of orthodox beliefs it was found necessary to find a revelational basis for a politically suitable orientation of theological doctrines involved in the questions mentioned above. This revelational basis is provided by Ahmadism. And the Ahamdis themselves claim this to be the greatest service rendered by them to British imperialism. The prophetic claim to a revelational basis for theological views of a political significance amounts to declaring that those who do not accept the claimant's views are infidel of the first water and destined for the flames of Hell. As I understand the

Ahmadism.

Another equally effective and more fruitful method, from the standpoint of the plain man, is to understand the real content of Ahmadism in the light of the history of Muslim theological thought in India, at least from the year 1799. Theyear 1799 is extremely important in the history of the world of Islam. In this year fell Tippu, and his fall meant the extinguishment of Muslim hopes for political prestige in India. In the same year was fought the battle of Navarino which saw the destruction of the Turkish fleet. Prophetic were the words of the author of the chronogram of Tippu's fall which visitors of Serangapatam find engraved on the wall of Tippu's mausoleum: “Gone is the glory of India as well as of Roum.” Thus in the year 1799 the political decay of Islam in Asia reached its climax. But just as out of the humiliation of Germany on the day of Jena arose the modern German nation, it may be said with equal truth that out of the political humiliation of Islam in the year 1799 arose modern Islam and her problems. This point I shall explain in the sequel. For the present I want to draw the reader's attention to some questions which have arisen in Muslim India since the fall of Tippu and the development of European imperialism in Asia.

Does the idea of Caliphate in Islam embody a religious institution? How are the Indian Muslims and for that matter all the Muslims outside the Turkish Empire related to the Turkish Caliphate? Is India Dar-ul-Harb or Dar-ul-Islam? What is the real meaning of the doctrine of Jihad in Islam? What is the meaning of the expression “from amongst you” in the Quranic verse: “Obey God, obey the Prophet and the

II

Coming now to the essence of Ahmadism. A discussion of its sources and of the way in which pre-Islamic Magian ideas have, through the channels of Islamic mysticism, worked on the mind of its author would be extremely interesting from the standpoint of comparative religion. It is, however, impossible for me to undertake this discussion here. Suffice it to say that the real nature of Ahmadism is hidden behind the mist of mediaeval mysticism and theology. The Indian ulema, therefore, took it to be a purely theological movement and came out with theological weapons to deal with it. I believe, however, that this was not the proper method of dealing with the movement; and that the success of the ulema was, therefore, only partial. A careful psychological analysis of the revelations of the founder would perhaps be an effective method of dissecting the inner life of his personality. In this connection I may mention Maulvi Manzoor Elahi's collection of the founder's revelations which offers rich and varied material for psychological research. In my opinion the book provides a key to the character and personality of the founder; and I do hope that one day some young student of modern psychology will take it up for serious study. If he takes the Quran for his criterion, as he must for reasons which cannot be explained here, and extends his study to a comparative examination of the experiences of the founder of the Ahmadiyya movement and contemporary non-Muslim mystics, such an Rama Krishna of Bengal, he is sure to meet more than one surprise as to the essential character of the experience on the basis of which prophethood is claimed for the originator of

Futuhat that the great Spanish mystic is as firm a believer in the Finality of Muhammad as any orthodox Muslim. And if he had seen in his mystical vision that one day in the east some Indian amateur in Sufism would seek to destroy the Holy Prophet's Finality under cover of his mystical psychology, he would have certainly anticipated the Indian ulema in warning the Muslims of the world against such traitors to Islam.

the Holy Prophet, he conveniently loses sight of the temporal meaning of the idea of finality. It is, however, obvious that the word buruz, in the sense eveil of complete likeness, cannot help him at all; for the buruz must always remain the other side of its original. Only in the sense of reincarnation a buruz becomes identical with the original. Thus if we take word buruz to mean “like in spiritualqualities” the argument remains ineffective; on the other hand, we take it to mean reincarnation of the original in the Aryan sense of the word, the argument becomes plausible; but its author turns out to be only a Magian in disguise.

It is further claimed on the authority of the great Muslim mystic, Muhyuddin Ibn-al-'Arabi of Spain, that it is possible for a Muslim saint to attain, in his spiritual evolution, to the kind of experience characteristic of the Prophetic consciousness. I personally believe this view of Sheikh Muhyuddin Ibn-al-'Arabi to be psychologically unsound; but assuming it to be correct, the Qadiani argument is based on a complete misunderstanding of his exact position. The Sheikh regards it as a purely private achievement which does not, and in the nature of things cannot, entitle such a saint to declare that all those who do not believe in him are outside the pale of Islam. Indeed, from the Sheikh's point of view, there may be more than one saint, living in the same age or country, who may attain to Prophetic consciousness. The point to be seized is that while it is psychologically possible for a saint to attain to Prophetic experience his experience will have no socio-political significance making him the centre of a new organisation and entitling him to declare this organisation to be the criterion of the faith or disbelief of the followers of Muhammad.

Leaving his mystical psychology aside I am convinced from a careful study of the relevant passage of the

organisation called “Islam” is perfect and eternal. No revelation, the denial of which entails heresy, is possible after Muhammad. He who claims such a revelation is a traitor to Islam. Since the Qadianis believe the founder of the Ahmadiyya movement to be the bearer of such arevelation, they declare that the entire world of Islam is infidel. The founder's own argument, quite worthy of a mediaeval theologian, is that the spirituality of the Holy Prophet of Islam must be regarded as imperfect if it is not creative of another prophet. He claims his own prophethood to be an evidence of the prophet rearing power of the spirituality of the Holy Prophet of Islam. But if you further ask him whether the spirituality of Muhammad is capable of rearing more prophets than one, his answer is “No.” This virtually amounts to saying: “Muhammad is not the last Prophet; I am the last.” Far from understanding the cultural value of the Islamic idea of Finality in the history of mankind generally and of Asia especially, he thinks that Finality in the sense that no follower of Muhammad can ever reach the status of Prophethood is a mark of imperfection in Muhammad's Prophethood. As I read the psychology of his mind he, in the interest of his own claim to prophethood, avails himself of what he describes as the creative spirituality of the Holy Prophet of Islam and at the same time deprives the Holy Prophet of his Finality by limiting the creative capacity of his spirituality to the rearing of only one prophet, i.e. the founder of the Ahmadiyya movement. In this way does the new prophet quietly steal away the Finality of one whom he claims to be his spiritual progenitor.

He claims to be buruz (بـــــروز) of the Holy Prophet of Islam insinuating thereby that, being a buruz, his “finality” is virtually the Finality of Muhammad; and that this view of the matter, therefore, does not violate the Finality of the Holy Prophet. In identifying the two finalities, his own and that of

the excommunication of the culprit. It may be admitted, however, that in the hands of mullas whose intellectual laziness takes all oppositions of theological thought asabsolute and is consequently blind to the unity in difference, this minor heresy may become a source of great mischief. This mischief can be remedied only by giving to the students of our theological schools a clearer vision of the synthetic spirit of Islam, and by reinitiating them into the function of logical contradiction as a principle of movement in theological dialectic. The question of what may be called major heresy arises only when the teaching of a thinker or a reformer affects the frontiers of the faith of Islam. Unfortunately this question does arise in connection with the teachings of Qadianism. It must be pointed out here that the Ahmadi movement is divided into two camps known as the Qadianis and the Lahoris. The former openly declare the founder to be a full prophet; the latter, either by conviction or policy, have found it advisable to preach an apparently toned down Qadianism. However, the question whether the founder of Ahmadism was a prophet, the denial of whose mission entails what I call the “major heresy” is a matter of dispute between the two sections. It is unnecessary for my purposes to judge the merits of this domestic controversy of the Ahmadis. I believe, for reasons to be explained presently, that the idea of a full prophet whose denial entails the denier's excommunication from Islam is essential to Ahmadism; and that the present head of the Qadianis is far more consistent with the spirit of the movement than the Imam of the Lahoris.

The cultural value of the idea of Finality in Islam I have fully explained elsewhere. Its meaning is simple: No spiritual surrender to any human being after Muhammad who emancipated his followers by giving them a law which is realisable as arising from the very core of human conscience. Theologically the doctrine is that the socio-political

only when the heretic rejects both or either of these prepositions. Such heresy must be and has been rare in the history of Islam which, while jealous of its frontiers, permits freedom of interpretation within these frontiers. And since the phenomenon of the kind of heresy which affects the boundaries of Islam has been rare in the history of Islam, the feeling of the average Muslim is naturally intense when a revolt of this kind arises. This is why the feeling of Muslim Persia was so intense against the Bahais. That is why the feeling of the Indian Muslims is so intense against the Qadianis.

It is true that mutual accusations of heresy for differences in minor points of law and theology among Muslim reliligious sects have been rather common. In this indiscriminate use of the word kufr both for minor theological points of difference as well as for the extreme cases of heresy, which involve the excommunication of the heretic, some present-day educated Muslims, who possess practically no knowledge of the history of Muslim theological disputes, see a sign of social and political disintegration of the Muslim community. This, however, is an entirely wrong notion. The history of Muslim theology shows that mutual accusation of heresy on minor points of difference has, far from working as a disruptive force, actually given an impetus to synthetic theological thought. "When we read the history of development of Mohammadan Law," says Prof. Hurgronje, "we find that, on the one hand, the doctors of every age, on the slightest stimulus, condemn one another" to the point of mutual accusations of heresy; and, on the other hand, the very same people with greater and greater unity of purpose try to reconcile the similar quarrels of their predecessors." The student of Muslim theology knows that among Muslim legists this kind of heresy is technically known as "heresy below heresy," i.e. the kind of heresy which does not involve

lands of Islam. The two propositions on which the conceptual structure of Islam is based are so simple that it makes heresy in the sense of turning the heretic outside the fold of Islam almost impossible. It is true that when a person declared to be holding heretical doctrines threatens the existing social order, an independent Muslim State will certainly take action; but in such a case the action of the State will be determined more by political considerations than by purely religious ones. I can very well realise that a man like the Pandit, who is born and brought up in a society which has no well-defined boundaries and consequently no internal cohesion, finds it difficult to conceive that a religious society can live and prosper without State-appointed commissions of enquiry into the beliefs of the people. This is quite clear from the passage which he quotes from Cardinal Newman and wonders how far I would accept the application of the Cardinal's dictum to Islam. Let me tell him that there is a tremendous difference between the inner structure of Islam and Catholicism wherein the complexity, the ultra-rational character and the number of dogma has, as the history of Christianity shows, always fostered possibilities of fresh heretical interpretations. The simple faith of Muhammad is based on two propositions that God is One, and that Muhammad is the last of the line of those holy men who have appeared, from time to time in all countries and in all ages, to guide mankind to the right ways of living. If, as some Christian writers think, a dogma must be defined as an ultra-rational proposition which for the purpose of securing religious solidarity must be assented to without any understanding of its metaphysical import, then these two simple propositions of Islam cannot be described even as dogms; for both of them are supported by the experience of mankind and are fairly amenable to rational argument. The question of a heresy, which needs the verdict, whether the author of it is within or without the fold, can arise, in the case of a religious society founded on suchsimple propositions,

easily find grounds of sympathy and appreciation in other faiths. Our great Indian poet, Amir Khusro, beautifully brings out the essence of this type of toleration in the story of an idol-worshipper. After giving an account of his intense attachment to his idols the poet addresses his Muslim readers as follows:

Only a true lover of God can appreciate the value of devotion even though it is directed to gods in which he himself does not believe. The folly of our preachers of toleration consists in describing the attitude of the man who is jealous of the boundaries of his own faith as one of intolerance. They wrongly consider this attitude as a sign of moral inferiority. They do not understand that the value of his attitude is essentially biological. Where the members of a group feel, either instinctively or on the basis of rational argument, that the corporate life of the social organism to which they belong is in danger, their defensive attitude must be appraised in reference mainly to a biological criterion. Every thought or deed in this connection must be judged by the life-value that it may possess. The question in this case is not whether the attitude of an individual or community towards the man who is declared to be a heretic is morally good or bad. The question is whether it is life-giving or life destroying. Pandit Jawahar Lal Nehru seems to think that a society founded on religious principles necessitates the institution of Inquisition. This is indeed true of the history of Christianity; but the history of Islam, contrary to the Pandit's logic, shows that during the last thirteen hundred years of the life of Islam, the institution of Inquisition has been absolutely unknown in Muslim countries. The Quran expressly prohibited such an institution. “Do not seek out the shortcomings of others and carry not tales against your brethren.” Indeed the Pandit will find from the history ofIslam that the Jews and Christians, fleeing from religious persecution in their own lands, always found shelter in the

regarding the Qadiani movement, which declares the entire world of Islam as Kafir and socially boycotts them, to be far more dangerous to the collective life of Islam in India than the metaphysics of Spinoza to the collective life of the Jews. The Indian Muslim, I believe, instinctively realises the peculiar nature of the circumstances in which he is placed in India and is naturally much more sensitive to the forces of disintegration than the Muslims of any other country. This instinctive perception of the average Muslim is in my opinion absolutely correct and has, I have no doubt, a much deeper foundation in the conscience of Indian Islam. Those who talk of toleration in a matter like this are extremely careless in using the word toleration which I fear they do not understand at all. The spirit of toleration may arise from very different attitudes of the mind of man. As Gibbon would say:

There is the toleration of the philosopher to whom all religions are equally true; of the historian to whom all are equally false; and of the politician to whom all are equally useful. There is the toleration of the man who tolerates other modes of thought and behaviour because he has himself grown absolutely indifferent to all modes of thought and behaviour. There is the toleration of the weak man who, on account of sheer weakness, must pocket all kinds of insults heaped on things or persons that he holds dear.

It is obvious that these types of tolerance have no ethical value. On the other hand, they unmistakably reveal the spiritual impoverishment of the man who practises them. True toleration is begotten of intellectual breadth and spiritual expansion. It is the toleration of the spiritually powerful man who, while jealous of the frontiers of his own faith, can tolerate and even appreciate all forms of faith other than his own. Of this type of toleration the trueMuslim alone is capable. His own faith is synthetic and for this reason he can

Story of Philosopy which, I hope, will give the reader a clear idea of the issue involved in Qadianism. Durant has in a few sentences summed up the Jewish point of view in the excommunication of the great philosopher Spinoza. The reader must not think that in quoting this passage I mean to insinuate some sort of comparison between Spinoza and the founder of Ahmadism. The distance between them, both in point of intellect and character, is simply tremendous. The “God-intoxicated” Spinoza never claimed that he was the centre of a new organisation and that all the Jews who did not believe in him were outside the pale of Judaism. Durant's passage, therefore, applies with much greater force to the attitude of Muslims towards Qadianism than to the attitude of the Jews towards the excommunication of Spinoza. The passage is as follows:

Furthermore, religious unanimity seemed to the elders their sole means of preserving the little Jewish group in Amsterdam from disintegration, and almost the last means of preserving the unity, and so ensuring the survival of the scattered Jews of the world. If they had their own state, their own civil law, their own establishments of secular force and power, to compel internal cohesion and external respect, they might have been more tolerant; but their religion was to them their patriotism as well as their faith; the synagogue was their centre of social and political life as well as of ritual and worship; and the. Bible, whose veracity Spinoza had impugned, was the “Portable Fatherland” of their people; under the circumstances they thought heresy was treason, and toleration suicide.

Situated as the Jews were—a minority community inAmsterdam, they were perfectly justified in regarding Spinoza as a disintegrating factor threatening the dissolution of their community. Similarly the Indian Muslims are right in

cultural sympathies, my mind cannot but inclined to the view that his desire to understand the questions he has raised is perfectly genuine; yet the way in which he has expressed himself betrays a psychology which I find difficult to attribute to him. I am inclined to think that my statement on Qadianism. no more than a mere exposition of a religious doctrine on modern lines—has embarrassed both the Pandit and the Qadianis perhaps because both inwardly resent, for different reasons, the prospects of Muslims political and religious solidarity, particularly in India. It is obvious that the Indian Nationalist, whose political idealism has practically killed his sense for fact, is intolerant of the birth of a desire for self-determination in the heart of north-west Indian Islam. He thinks wrongly in my opinion, that the only way to Indian Nationalism lies in a total suppression of the cultural entities of the country through the interaction of which India can evolve a rich and enduring culture. A nationalism achieved by such methods can mean nothing but mutual bitterness and even oppression. It is equally obvious that the Qadianis, too, feel nervous by the political awakening of the Indian Muslims, because they feel that the rise in political prestige of the Indian Muslims is sure to defeat their designs to carve out from the ummat of the Arabian Prophet a new ummat for the Indian 'prophet'. It is no small surprise to me that my effort to impress on the Indian Muslims the extreme necessity of internal cohesion in the present critical moment of their history in India, and my warning them against the forces of disintegration, masquerading as reformist movements, should have given the Pandit an occasion to sympathise with such force.

However, I do not wish to pursue the unpleasant task of analysing the Pandit's motives. For the benefit of those who want further elucidation of' the general Muslim attitude towards. the Qadianis, I would quote a passage from Durant's

5. Vide pp. 161-66 ante.

(5)
Islam and Ahmadism *

On the appearance of Pandit Jawahar Lal Nehru's three articles in the Modem Review of Calcutta I received a number of letters from Muslims of different shades of religious and political opinion. Some writers of these letters want me to further elucidate and justify the attitude of the Indian Muslims towards the Ahmadis. Others ask me what exactly I regard as the issue involved in Ahmadism. In this statement I propose first to meet these demands which I regard as perfectly legitimate, and then to answer the questions raised by Pandit Jawahar Lal Nehru. I fear, however, that parts of this statement may not interest the Pandit, and to save his time I suggest that he may skip over such parts.

It is hardly necessary for me to say that I welcome the Pandit's interest in what I regard as one of the greatest problems of the East and perhaps of the whole world. He is, I believe, the first Nationalist Indian leader who has expressed a desire to understand the present spiritual unrest in the world of Islam. In view of the many aspects and possible reactions of this unrest it is highly desirable that thoughtful Indian political leaders should open their mind to the real meaning of what is, at the present moment, agitating the heart of Islam.

I do not wish, however, to conceal the fact either from the Pandit or from any other reader of this statement that the Pandit's articles have for the moment given my mind rather a painful conflict of feelings. Knowing him to be a man of wide

** This is a reply to the questions raised by Pandit Jawahar Lal Nehru in his criticism of Allama Iqbal's statement on Qadianis and Orthodox Muslims. Nehru's criticism had appeared under the title Solidarity of Islam --comment on Iqbal's Article, in the Modem Review of Calcutta and the Allama's reply to the Pandit was published in the Islam of Lahore in January 1936.*

surprise that a community which has, for its birth and growth, depended entirely upon the liberalism of a modern State should resent my demand for the protection of Islam against religious adventurers.

The Qadiani logic, again, sees in my statement the suggestion that the British Government ought to have suppressed the Qadiani movement by force. I have made it perfectly clear in my statement that the policy of non-interference in religion is “indispensable” in India which is pre-eminently a country of religious communities. I am no admirer of liberalism and regard it as a set of ideas which tend to make man what he ought not to be; yet I cannot deny it as a powerful force in the modern world. It seems that Mirza Mahmud either does not understand the meaning of the word “indispensable” or conveniently ignores it altogether.

The Romans might have recognised Jesus and his followers as a new religious community, but this method of protecting the Jewish society was not open to them as at the time when Jesus was brought before Pilate he had practically no followers. It is, however, open to British in India toadministratively recognise the Qadianis as a separate community. I honestly believe that this is the only way to peace. Nor ought the Qadianis to be anxious to remain as a part and parcel of a community which they regard as a community of infidels.

sentence. It is obvious that since he has got nothing to say against the main point of my statement he means only to hoodwink his poor followers and perhaps also the Government into the belief that since I think the Jews better protected under the Romans than the Indian Muslims under the British, it follows, therefore, that I regard the Roman Governor's approval of the decision of the Jewish Synod as a virtuous act. No greater misrepresentation can be imagined. It was not my intention to pass a moral judgment on the Romans. My statement viewed the situation from a purely political and not from a moral point of view. The whole point is that the Romans considered themselves to be constitutionally bound to approve the decision of the Jewish Synod in matters which the Jews, rightly or wrongly, regarded as dangerous to the integrity of their society. In the particular instance of the trial of Jesus (may the peace of Allah be on him) it was unfortunate that the Romans, as aState, had to accept the Synod's demand in connection with a man who, according to our belief, happened to be a genuine prophet. Had it been a case of a religious adventurer, nobody would have morally blamed the Romans for their approval of the Synod's decision or the Jews for their demand for the trial. Personally I cannot deny the value of the constitutional protection given by the Romans to the Jews even though I take a different view of the moral valuation of that protection. It is probable that one day the Qadianis themselves may seek protection against their own rebel prophets for whom the Qadiani vulgarisation of Islamic religious ideas has made it possible to grow and prosper. Any one of them may, at any time, gather sufficient strength and following to threaten the present organisation of that community. To me it is a matter of

(4)
Jewish Integrity under Roman Rule *

[The special representative of the fortnightly Islam asked Dr. Sir Muhammad Iqbal whether his views had been correctly stated by Mirza Bashir-ud-Din Mahmud of Qadian in the following passage of. his recent Friday sermon reported in the Qadiani paper Sunrise:

* Islam, 22 June 1935, p.3.

He has a grievance against the Government when he says that the British have not been even as wise as were the Romans in the days of Jesus, for the Romans after all crucified Jesus. This is nothing but approving the action of the Romans when they capitulated their own authority and made over Jesus to the Jews, having been influenced by the fanatical clamour of the latter.

“I draw your special attention to the words 'approving the action of the Romans' in the above passage,” said our special representative, “with a view to discover whether such a sentence does occur in your statement on the Finality of the Holy Prophet of Islam published sometime back in the Indian and Anglo-Indian press.” Sir Muhammad lqbal said:
Ed.I]

This is a typical instance of the Qadiani art of misrepresentation. Mirza Mahmud reads in my statement a sentence which he does not quote and which I have not been able to find in that statement. The fact of the matter seems to be that he imagines certain thoughts of his own to be a specific

shows that in their present position they do not find themselves entitled to any representation in legislative bodies. The new constitution is not without provisions for the protection of such minorities. To my mind, it is clear that in the matter of approaching the Government for separation the Qadianis will never take the initiative. The Muslim community is perfectly justified in demanding their immediate separation from the parent community. If the Government does not immediately agree to this demand, the Indian Muslims will be driven to the suspicion that the British Government is keeping the new religion in store, as it were, and delaying the separation because in view of the small number of its adherents, it is, for the present, incapable of functioning as a fourth community in the province which may effectively damage the already marginal majority of Punjab Muslims in the local legislature. The Government did not wait for a formal representation for separation by the Sikhs in 1919: why should they wait for a formal representation by the Qadianis?

obvious political advantages.

Secondly, we must not forget the Qadianis' own policy and their attitude towards the world of Islam. The founder of the movement described the parent community as “rotten milk” and his own followers as “fresh milk”, warning the latter against mixing with the former. Further, their denial of fundamentals, their giving themselves a new name (Ahmadis) as a community, their non-participation in congregational prayers of Islam, their social boycott of Muslims in the matter of matrimony, etc., and above all their declaration that the entire world of Islam is Kafir—all these things constitute an unmistakable declaration of separation by the Qadianis themselves. Indeed the facts' mentioned above clearly show that they are far more distant from Islam than the Sikhs from Hindusim, for the Sikhs at least intermarry with the Hindus, even though they do not worship in the Hindu temples.

Thirdly, it does not require any special intelligence to see why the Qadianis, while pursuing a policy of separation in religious and social matters, are anxious to remain politically within the fold of Islam. Apart from the political advantages in the sphere of Government service which accrue to them by remaining within the fold of Islam, it is obvious that in view of their present population, which, according to the lastcensus, is fifty-six thousand only, they are not entitled even to a single seat in any legislature of the country and cannot, therefore, be regarded as a political minority in the sense in which you seem to be using the expression. The fact that the Qadianis have not so far asked for separation as a distinct political unit

the Muslim points of view. You want me 'to make it perfectly clear whether, when or where I can tolerate official cognizance of any one community's religious differences. Let me point out:

First, that Islam is essentially a religious community with perfectly defined boundaries belief in the Unity of God, belief in all the Prophets and belief in the finality of Muhammad's Prophethood. The last mentioned belief is really the factor which accurately draws the line of demarcation between Muslims and non-Muslims and enables one to decide whether a certain individual or group is a part of community or not. For example, the Brahmos believe in God, they also regard Muhammad (on whom be peace) as one of the Prophets of God, yet they cannot be regarded as part and parcel of Islam because they, like the Qadian is, believe in the theory of perpetual revelation through prophets and do not believe in the Finality of Prophethood in Muhammad. No Islamic sect, as far as Iknow, has ever ventured to cross this line of demarcation. The Bahais in Persia have openly rejected the principle of Finality but have at the same time frankly admitted that they are a new community and not Muslims in the technical sense of the word. According to our belief, Islam as a religion was revealed by God, but the existence of Islam as a society or nation depends entirely on the personality of the Holy Prophet. In my opinion, only two courses are open to the Qadianis, either frankly to follow the Bahais or to eschew their interpretations of the idea of Finality in Islam and to accept the idea with all its implications. Their diplomatic interpretations are dictated merely by a desire to remain within the fold of Islam for

(3)
A Letter to The Statesman *

[The Statesman published Dr. Iqbal's statement on "Qadianis and Orthodox Muslims" along with a criticism of it in the first leader. The following letter was in reply addressed to The Statesman and was published on 10 June 1935.]

I am very thankful to you for your critical leader on my statement which was published in your issue of the 14th May. The question which you have raised in your leader is a very important one, and I am really very glad that you have raised it. I did not raise it in my statement because I felt that, considering the separatist policy of the Qadianis, which they have consistently pursued in religious and social matters ever since the birth of the idea of building a new community on the foundations of a rival prophethood and the intensity of the Muslim feeling against this move, it was rather the duty of the Government to take administrative cognizance of such a fundamental difference between the Qadianis and the Muslims without waiting for a formal representation on behalf of the Muslim community of India. I was encouraged in this feeling by the Government's attitude in the matter of the Sikh community which till 1919 was not administratively regarded as a separate political unit but which was later treated as such without any formal representation on the part of the Sikhs, in spite of the Lahore High Court's finding that the Sikhs were Hindus.

However, now that you have raised this question I should like to offer a few observations on a matter which I regard as of the highest importance both from the British and

Magian thought and religious experience very much permeate Muslim theology, philosophy and Sufism. Indeed there is evidence to show that certain schools of Sufism now known as Islamic have only repeated the Magian type of religious experience. I regard Magian culture as one form among other forms of human culture and did not use the term as a sort of stigma. It had its ruling concepts, its philosophical discussions, its truths and its errors. But when a culture begins to show signs of decay, its philosophical discussions, its concepts and its forms of religious experience become fixed and immobile. It was at that time in the history of Magian culture that Islam appeared and, according to my reading of cultural history, entered a strong protest against that culture. There is definite evidence in the Quran itself to show that Islam aimed at opening up new channels not only of thought but of religious experience as well. Our Magian inheritance, however, has stifled the life of Islam and never allowed the development of its real spirit and aspirations.

experience. The function of Sufism in Islam has been to systematize mystic experience; though it must be admitted that Ibn-i-Khaldun was the only Muslim who approached it in a thoroughly scientific spirit.

The opening sentence clearly shows that saints in the psychological sense of the word or men of saintly character will always appear. Whether Mirza Sahib belonged to this category or not is a separate question. Indeed as long as the spiritual capacity of mankind endures, they will rise among all nations and countries in order to show better ideals of life to man. To hold otherwise would be to fly in the face of human experience. The only difference is that the modern man has the right to critical examination of their mystic experiences. The Finality of the Prophethood means, among other things, that all personal authority in religious life, denial of which involves damnation, has come to an end.

* * *

Questioned about a letter published in The Statesman from Mr Dinshaw, a Parsi gentleman, Dr. Iqbal said:

I have got nothing to say about it, except that I fully agree with his main thesis that to the Persian element belongs a very rich role in the external as well as the internal history of Islam. This Persian influence is so extensive that Spengler has been misled by Magian overlaying of Islam and has practically taken Islam for a Magian religion. In my Reconstruction I have made an attempt to divest Islam of its Magian encrustations and I hope to be able to do further work in this direction in my Introduction to the Study of theQuran.[4]

4So far as-is known this Introduction was never written. (Ed.)

** More than two-thirds of this letter was reproduced in Islam, Lahore, 22 June 1935.*

contradicting himself. Only stones do not contradict themselves, as Emerson says.

* * *

Questioned about the possibility of divine inspiration and the advent of inspired reformers after the Holy Prophet, Dr. Iqbal replied:

I had better answer this question by referring you to my Reconstruction of Religious Thought in Islam, in which I wrote on pp. 120-21:

The idea of finality... should not be taken to suggest that the ultimate fate of life is complete displacement of emotion by reason. Such a thing is neither possible nor desirable. The intellectual value of the idea is that it tends to create an independent critical attitude towards mystic experience by generating the belief that all personal authority, claiming a supernatural origin, has come to an end in the history of man. This kind of belief is a psychological force which inhibits the growth of such authority. The function of the idea is to open up fresh vistas of knowledge in the domain of man's inner experience. Just as the first half of the formula of Islam has created and fostered the spirit of critical observation of man's outer experience by divesting the forces of Nature of that divine character with which earlier cultures had clothed them. Mystic experience, then, however unusual and abnormal, must now be regarded by the Muslim as a perfectly natural experience, open to critical scrutiny like other aspects of human experience. This is clear from the Prophet's own attitude towards Ibn-i-Sayyad's psychic

Questioned whether he had seen a letter published in The Sunrise (another Qadiani weekly) in which the writer had referred to a lecture of Dr. Iqbal and accused him of inconsistency, the Doctor replied:

Yes: I am sorry I have no copy of the lecture in question either in the original English or in the Urdu translation which was made by Maulana Zafar Ali Khan. As far as I remember, the lecture was delivered in 1911, or perhaps earlier. I have no hesitation in admitting that about a quarter of a century ago I had hopes of good results following from this movement. Earlier still, even that eminent Muslim, the late Maulvi Chiragh Ali, the author of several English books on Islam, co-operated with the founder of the movement and, I understand, made valuable contributions to the book called Barahin-i-Ahmadiyya. But the real content and spirit of a religious movement does not reveal itself in a day. It takes decades to unfold itself. The internal quarrels between the two sections of the movement is evidence of the fact that even those who were in personal contact with the founder were not quite aware of how themovement would evolve itself. Personally, I became suspicious of the movement when the claim of a new prophethood, superior even to the Prophethood of the Founder of Islam, was definitely put forward, and the Muslim world' was declared Kafir. Later my suspicions developed into a positive revolt when I heard with my own ears an adherent of the movement mentioning the Holy Prophet of Islam in a most disparaging language. Not by their roots but by their fruits will you know them. If my present attitude is self-contradictory, then, well, only a living and thinking man has the privilege of

Questioned about the tradition quoted by The Light that Mujaddids appear at the head of every century, Dr. Iqbal replied:

The editor of The Light quotes a tradition which gives a mathematically exact picture of the historical process. While I do believe in man's spiritual capacity and the possibility of the birth of spiritual men, I am not sure that the historical process is so mathematical as The Light thinks. We can easily confess that it is beyond our intellectual capacity to understand the nature of the historical process. All that I can negatively say is that it does not appear to me to be as fixed and mathematically exact as The Light thinks. I am rather inclined to Ibn Khaldun's view which regards the historical process as a free creative movement and not a process which

3. The Reconstruction of Religious Thought in Islam. (Ed.)has already been worked out with definite landmarks. This view has been put forward in modern times by Bergson with much greater wealth of illustration and scientific accuracy than by Ibn Khaldun. The tradition quoted by The Light was probably popularised by Jalal-ud-Din Suyuti in his own interest and much importance cannot be attached to it. It is not mentioned in Bukhari and Muslim, the two books which are believed to be most reliable, it may embody a vision of the nature of the historical process by some spiritual men, but this personal vision of the individuals can form no basis for logical argument. This is the rule which expert traditionists have always observed.

* * *

(2)
Rejoinder to The Light, etc.

Criticising the foregoing statement, The Light (a Qadiani weekly) remarked: “Like some other great thinkers, he (Dr. Iqbal) does not believe in the communion of man with God through the instrumentality of what is known as verbal revelation.” Interviewed by a Press representative about this accusation, Dr. Iqbal said: The Light bases its accusation on an Urdu verse of mine.

This is plain Urdu and only means that there is a higher stage in the spiritual life of man than verbal communion. But the verse has nothing to do with the doctrine of verbal revelation as a theological doctrine for which I must refer The Light to my Reconstruction[3] in which I wrote on page 21:

The organic relation of feeling and idea throws light on the old theological controversy about verbal revelation which once gave so much trouble to Muslim religious thinkers. Inarticulate feeling seeks to fulfil its destiny in idea which, in its turn, tends to develop out of itself its own visible garment. It is no mere metaphor to say that idea and word both simultaneously emerge out of the womb of feeling, though logical understanding cannot but take them in a temporal order and then create its own difficulty by regarding them as mutually isolated. There is a sense in which the word is also revealed.

* * *

Postscript

I understand that this statement has caused some misunderstanding in some quarters. It is thought that I have made a subtle suggestion to the Government to suppress the Qadiani movement by force. Nothing of the kind. I have made it clear that the policy of non-interference in religion is the only policy which can be adopted by the rulers of India. No other policy is possible. I confess, however, that to my mind this policy is harmful to the interests of religious communities; but there is no escape from it and those who suffer will have to safeguard their interests by suitable means. The best course for the rulers of India is, in my opinion, to declare the Qadianis a separate community. This will be perfectly consistent with the policy of the Qadianis themselves and the Indian Muslim will tolerate them just as he tolerates the other religions.

But the religious issue is not the only issue which is at present agitating the minds of the Punjab Muslims. There are other quarrels of a political nature to which, according to my reading, Sir Herbert Emerson hinted in his speech at the Anjuman's[2] anniversary. These are, no doubt, of a purely political nature, but they affect the unity of the Punjab Muslims as seriously as the religious issue. While thanking the Government for their anxiety to see the Punjab Muslims united, I venture to suggest a little self-examination to the Government themselves. Who is responsible, I ask, for the distinction of rural and urban Muslims—a distinction which has cut the Muslim community into two groups and the rural group into several sub-groups constantly at war with one another?

Sir Herbert Emerson deplores the lack of proper leadership among the Punjab Muslims. But I wish Sir Herbert Emerson realised that the rural-urban distinction created by the Government and maintained by them through ambitious political adventures whose eyes are fixed on their own personal interests and not on the unity of Islam in the Punjab has already made the community incapable of producing a real leader. It appears to me that this device probably originated in a desire rather to make it impossible for real leadership to grow. Sir Herbert Emerson deplores the lack of leadership in Muslims; I deplore the continuation.

2. Anjuman Himayat-i-Islam, Lahore. (Ed.)by the Government of a system which has crushed out all hope of a real leader appearing in the province.

And what are the ways of self-defence?

Controversial writings and refutations of the claims of the man who is regarded by the parent community as a religious adventurer. Is it then fair to preach toleration to the parent community whose integrity is threatened and to allow the rebellious group to carry on its propaganda with impunity, even when the propaganda is highly abusive?

If a group, rebellious from the point of view of the parent community, happens to be of some special service to Government, the latter are at liberty to reward their services as best they can. Other communities will not grudge it. But it is too much to expect that the community should calmly ignore the forces which tend seriously to affect its collective life. Collective life is as sensitive to the danger of dissolution as individual life, it is hardly necessary to add in this connection that the mutual theological bickerings of Muslim sects do not affect vital principles on which all these sects agree with all their differences in spite of their mutual accusations of heresy. There is one further point which demands Government's special consideration. The encouragement in India of religious adventurers on the ground of modern liberalism tends to make people more and more indifferent to religion and will eventually completely eliminate the important factor of religion from the life of Indian communities. The Indian mind will then seek some other substitute of religion, which. is likely to be nothing less than the form of atheistic materialism which has appeared in Russia.

Western people who cannot but adopt a policy of non-interference in religion. This liberal and indispensable policy in a country like India has led to most unfortunate results. In so far as Islam is concerned, it is no exaggeration to say that the solidarity of the Muslim community in India under the British is far less safe than the solidarity of the Jewish community in the days of Jesus under the Romans. Any religious adventurer in India can set up any claim and carve out a new community for his own exploitation. This liberal State of ours does not care a fig for the integrity of a parent community, provided the adventurer assures it of his loyalty and his followers are regular in the payment of taxes due to the State. The meaning of this policy for Islam was quite accurately seen by our great poet Akbar who in his usual humorous strain says:

"O friends! pray for the glory of the Briton's name, Say 'I am God' sans chain, sans cross, sans shame."

I very much appreciate the orthodox Hindus demand for protection against religious reformers in the new constitution. Indeed, the demand ought to have been first made by the Muslims who, unlike the Hindus, entirely eliminate the race idea from their social structure. The Government must seriously consider the present situation and try, if possible, to understand the mentality of the average Muslim in regard to this issue which he regards as absolutely vital to the integrity of his community. After all, if the integrity of a community is threatened, the only course open to that community is to defend itself against the forces of disintegration.

1. Governor of the Punjab. (Ed.)

Muslims never used this expression. The expression did not appeal to them probably because they thought that it implied a false conception of the historical process. The Magian mind regarded Time as a circular movement; the glory of elucidating the true nature of the historical process as a perpetually creative movement was reserved for the great Muslim thinker and historian, Ibn Khaldun.

The intensity of feeling which the Indian Muslims have manifested in opposition to the Qadiani movement is, therefore, perfectly intelligible to the student of modern sociology. The average Muslim, who was the other day described as nzulla-ridden by a writer in The Civil andMilitaty Gazette, is inspired in his opposition to the movement more by his instinct of self-preservation than by a fuller grasp of the meaning of the ideal of Finality in his faith. The so-called "enlightened" Muslim has seldom made an attempt to understand the real cultural significance of the idea of Finality in Islam, and a process of slow and imperceptible Westernisation has further deprived him even of the instinct of self-preservation. Some of these so-called enlightened Muslims have gone to the extent of preaching "tolerance" to their brethren-in-faith. I can easily excuse Sir Herbert Emerson[1] for preaching toleration to Muslims; for a modern European who is born and brought up in an entirely different culture does not, and perhaps cannot, develop the insight which makes it possible for one to understand an issue vital to the very structure of a community with an entirely different cultural outlook.

In india circumstances are much more peculiar. This country of religious communities, where the future of each community rests entirely upon its solidarity, is ruled by a

Of the two forms which the modern revival of pre-Islamic Magianism has assumed, Bahaism appears to me to be far more honest than Qadianism; for the former openly departs from Islam, whereas the latter apparently retains some of the more important externals of Islam with an inwardness wholly inimical to the spirit and aspirations of Islam. Its idea of a jealous God with an inexhaustible store of earthquakesand plagues for its opponents; its conception of the prophet as a soothsayer; its idea of the continuity of the spirit of Messiah, are so absolutely Jewish that the movement can easily be regarded as a return to early Judaism. The idea of the continuity of the spirit of Messiah belongs more to Jewish mysticism than to positive Judaism. Professor Buber who has given an account of the movement initiated by the Polish Messiah Baalshem tells us that "It was thought that the spirit of the Messiah descended upon the earth through the prophets and even through a long line of holy men stretching into the present time. "the Zaddiks" (Sadiqs). Heretical movements in Muslim Persia under the pressure of pre-Islamic Magian ideas invented the words "buruz", "hulul", "zill" to cover this idea of perpetual reincarnation. It was necessary to invent new expressions for a Magian idea in order to make it less shocking to Muslim conscience. Even the phrase "promised Messiah" is not a product of Muslim religious consciousness. It is a bastard expression and has its origin in the pre-Islamic Magian outlook. We don't find it in early Islamic religious and historical literature. This remarkable fact is revealed by Prof. Wensinck's Concordance of the Traditions of the Holy Prophet which covers no less than 11 collections of the traditions and three of the earliest historical documents of Islam. One can very well understand the reason why early

the bosom of Islam, which claims a new prophethood for its basis, and declares all Muslims who do not recognise the truth of its alleged revelations as Kafirs, must, therefore, be regarded by every Muslim as a serious danger to the solidarity of Islam. This must necessarily be so, since the integerity of Muslim society is secured by the ideas of the Finality of Prophethood alone.

This idea of Finality is perhaps the most original idea in the cultural history of mankind; its true significance can be understood by only those who carefully study the history of pre-Islamic Magian culture in Western and Middle Asia. The concept of Magian culture, according to modern research, includes cultures associated with Zoroastrianism, Judaism, Jewish Christianity, Chaldean and Sabean religions. To these creed-communities the idea of the continuity of prophethood was essential, and consequently they lived in a state of constant expectation. It is probable that the Magian man psychologically enjoyed this state of expectation. The modern man is spiritually far more emancipated than the Magian man. The result of the Magian attitude was the disintegration of old communities and the constant formation of new ones by all sorts of religious adventures. In the modern world of Islam, ambitious and ignorant mullasim, taking advantage of the modern Press, has shamelessly attempted to hurl the old pre-Islamic Magian outlook in the face of the twentieth century. It is obvious that Islam which claims to weld all the various communities of the world into one single community cannot reconcile itself to a movement which threatens its solidarity and holds the promise of further rifts in human society.

(1)
Qadianism and Orthodox Muslims *

The issue created by the controversy between the Qadianis and the orthodox Muslims is extremely important. The Indian Muslims have only recently begun to realise its importance. I intended to address an open letter to the British people explaining the social and political implications of the issue but unfortunately my health prevented me from doing so. I am, however, glad to say a few words for the present on a matter which, to my mind, affects the entire collective life of the Indian Muslims. It must, however, be pointed out at the outset that I have no intention to enter into any theological argument. Nor do I mean to undertake a psychological analysis of the mind of the founder of the Qadiani movement; the former will not interest those for whom this statement is meant and the time for the latter has not yet arrived in India. My point of view is that of a student of general history and comparative religion.

India is a land of many religious communities; and Islam is a religious community in a much deeper sense than those communities whose structure is determined partly by the religious and partly by the race idea. Islam repudiates the race idea altogether and founds itself on the religious idea alone. Since Islam bases itself on the religious idea alone, a basis which is wholly spiritual and consequently far more ethereal than blood relationship, Muslim society is naturally much more sensitive to forces which it considers harmful to its integrity. Any religious society, historically arising from

The Statesman, Calcutta, 14th May, 1935.

S.NO No	Headings	Page
1.	Qadianism and Orthodox Muslims	5
2.	Rejoinder to The Light, etc.	13
3.	A Letter to The Statesman	19
4.	Jewish Integrity under Roman Rule	23
5.	Islam and Ahmadism	26
6.	Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21st June, 1936.	58

ISLAM AND QADIANISM

Dr. Allama Muhammad Iqbal

Editor in Chief:

Khawaja Ghulam Dastagir Farooqi

Published by:

Idara -Tul - Muntaha Pakistan

Sāhibzādah Najmul-Amīn' Urus Fāruqī

Composed two short poems to appreciate the contribution of quarterly Al Muntahā in preservation of the Finality of Prophethood and denunciation of Qādiyāniyat and Aḥmadiyat. The poems in Urdu are translated into English by Dr. Hafiz KhurshidAḥmadQādrī on Khawājah Ghulām Dastagīr Fārūqī' s desire.

Al-Muntahā

(1)

O' treasure of Truthfulness and Purity

You are welcome from the core of my heart, Al Muntahā.

Well acquainted with the Finality of Prophethood

Height of cognizance, Al Muntahā.

Reading your ecstatic lines

It's a peak of joy, Al Muntahā

How faith enrichening the moment was

When came out, Al Muntahā

A great job is being done

By the supreme, Al Muntahā

May you remain on the right path

I pray to Almighty, Al Munataā.

(2)

I have received Al Muntahā

I am convinced of (the greatness) of Al Muntahā

Prophethood has sealed by the Mustafā (SAW)

It is the very objective of Al Muntahā.

Regd. 2-66/8288

Quarterly
Almuntaha
(Rgd)

Vol.8 | Jan To Jun 2024 | No.26-27

The Authors are responsible for the content of the Articles Published in Al-Muntaha.

Price Each Magazine 250/-

Ghulam Dastgir Farooqi Printed at from Minhaj ul Quran Publications and Published from Astana Chishtia Khaairia Shakargarh.

An Educational and Exploratory Magazine on Khatm-e-Nabuwwat

Vol.8 Jan To Jun 2024 No.26-27

Chief Editor:
Khawaja Ghulam Dastagir Farooqi